Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1962ء

پرویز صاحب کے حالیہ دورہ کراچی کا ایک منظر
(تفصیل اندر ملاحظہ فرمائیے)

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت ۵/

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدل اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر (۷۵۰۰)
ہندو پاکستان سے سالانہ ۸ روپے	ہندو پاکستان سے	خط و کتابت کا پتہ
غیر ممالک سے سالانہ ۱۶ شلنگ	۷۵ نئے پیسے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

(جلد ۱۵) — دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء — (نمبر ۱۲)

فہرستِ مضامین

لمعات ——— ۲

حقائقِ دعیر۔ (فرقوں کا خاتمہ۔ غلامی کی لعنت) ——— ۱۰

باب المراسلات۔ (اسلام میں جھوٹ بولنے کی اجازت) ——— ۱۳

منزل کی طرف اک اور قدم۔ (پرویز صاحب کا دورۂ کراچی) (محترم ابو عاکف صاحب) ۱۵

ظالم پنپ نہیں سکتا۔ (محترم پرویز صاحب) ——— ۴۱

نقد و نظر ——— ۵۵

پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ (محترم پرویز صاحب) ——— ۵۷

مجلسِ اقبالؒ ——— ۶۸

استفسارات (قرآن کریم کے احکام میں تبدیلی — ایک مظلوم بیوہ) ——— ۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کھلی چٹھی ——— ممبرانِ اسمبلی کے نام

برادرانِ عزیز! السلام علیکم۔ آپ مملکتِ پاکستان کی نیشنل اسمبلی کے ارکان منتخب ہو کر آئے ہیں۔ یوں تو آپ کے مختلف فرائض اور گوناگوں ذمہ داریاں ہوں گی لیکن وہ بنیادی مقصد جس کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آیا ہے، ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ نے مملکت کے لئے قوانین مرتب کرنے ہیں۔ اگرچہ قانون سازی کا فریضہ ہر مملکت میں خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن مملکتِ پاکستان میں اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے، اور اسی لحاظ سے اس کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ آئینِ پاکستان میں یہ شق درج ہے کہ یہاں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو اسلام کے خلاف ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ذمے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ آپ ایسے قوانین مرتب کریں جو اسلام کے خلاف نہ ہوں۔ ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی ایسی پارلیمان کا انتخاب عمل میں آیا ہے جس کے

تاریخ میں پہلا موقعہ

ذمے یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کے مطابق قوانین مرتب کرے۔ اس لئے آپ اندازہ فرمائیے کہ آپ کی ذمہ داری کس قدر اہم ہے۔ آئینِ پاکستان کی رُو سے آپ کی مدد کے لئے ایک اسلامی کونسل کا تقرر کیا گیا ہے لیکن اس کی حیثیت محض مشاورتی ہے۔ آپ کا جی چاہے اس کونسل سے مشورہ کریں، جی چاہے نہ کریں۔ پھر جی چاہے تو اس کے مشورہ کو قبول کریں، جی چاہے اسے مسترد کر دیں۔ دوسری طرف پارلیمان سے بالا کوئی ایسی اتھارٹی (عدالتِ عالیہ وغیرہ) نہیں جس سے یہ استصواب کر لیا جائے کہ آپ نے جو قانون وضع کیا ہے وہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ جو قانون بھی منظور کر دیں گے وہ اسلامی متصور ہوگا۔ اور مسلمانانِ پاکستان پر اس کی اطاعت، اسلامی قانون کی حیثیت سے لازم آجائے گی۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے جو آپ کے سر پر عائد ہوتی ہے۔ اگر آپ کا مرتب کردہ کوئی قانون اسلام کے خلاف ہوا تو پاکستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے خلافِ اسلام عمل کی ذمہ داری آپ پر ہوگی اور آپ اس کے لئے خدا کے ہاں مسئول ہوں گے۔ یعنی آپ کی غلطی، نو کروڑ مسلمانوں کو خلافِ اسلام راستے پر ڈال دے گی، اور اس طرح ان کے گناہوں کا سارا بوجھ آپ کی گردن پر ہوگا۔ قرآن کریم کے الفاظ ہیں۔

لِيَحْمِلُوٓا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلَا سَآءَ مَا يَزِرُونَ ——— (۱۶/۲۵)

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کے دن اپنے پورے کے پورے بوجھ بھی اٹھائے ہوں گے اور ان لوگوں کے گناہوں کے بوجھ کا ایک حصہ بھی جنہیں یہ بغیر علم گمراہ کرتے ہیں ——— ذرا سوچو کہ کتنا بڑا ہے وہ بوجھ جسے یہ اٹھاتے ہیں۔

آپ کی لغزش کا نتیجہ

یہ ہے وہ ذمہ داری جسے آپ نے اپنے سر پر لیا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اس باب میں آپ کی ذرا سی بے احتیاطی آپ کو کہاں پہنچا دے گی۔

کہتے ہیں کہ ایک دن امام اعظمؒ بازار میں جا رہے تھے۔ بارش ہو کر کھل چکی تھی اور سڑک پر کیچڑ تھی۔ آپ کے آگے آگے ایک لڑکا اچھلتا کودتا جا رہا تھا۔ آپ نے اسے پکارا اور کہا کہ بیٹا! سنبھل کر چلو۔ گر جاؤ گے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ امامؒ صاحب کو پہچان لیا اور کہا کہ حضرت! میری فکر نہ کیجئے۔ آپ احتیاط برتئے۔ اگر میں گرا تو اس کا نقصان صرف مجھے ہی ہوگا۔ لیکن اگر آپ گرے تو پوری کی پوری امت گر پڑے گی۔

اس لئے برادرانِ محترم! آپ کو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ جب تک آپ اس اسمبلی کے ممبر نہیں تھے آپ کی غلطی کا نقصان آپ کی ذات تک محدود تھا۔ لیکن اب آپ کی بے احتیاطی پوری ملتِ پاکستانیہ کی تباہی کا موجب بن جائے گی۔ اور اس تباہی کا سلسلہ اس زندگی کے بعد آخرت تک جائے گا۔

یہ ہے وہ فریضہ جسے آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔

۲۔ سوال یہ ہے کہ آپ کے پاس وہ کون سا ذریعہ ہے جس سے آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جو قانون آپ مرتب کر رہے ہیں وہ اسلام کے خلاف نہیں۔ وہ کون سا معیار ہے جس پر آپ ہر زیرِ بحث مسودۂ قانون کو پرکھ کر دیکھیں گے کہ وہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ وہ کون سا پیمانہ ہے جس سے آپ یہ ماپ کر اپنا اطمینان کریں گے کہ

وہ معیار کون سا ہے

جس قانون کی تائید میں آپ نے اپنا ہاتھ اٹھایا ہے وہ اسلام کے مطابق ہے، اور جسے مسترد کرنے کے لئے آپ نے (NO) کہا ہے، وہ اسلام کے خلاف ہے۔ یاد رکھئے آپ کا یہ اطمینان اس درجہ کا ہونا چاہیئے کہ جب آپ سے اس کی باز پرس ہو تو آپ کا جواب خدا کو بھی مطمئن کر سکے۔

آپ نے سوچ لیا ہے کہ آپ کے نیشنل اسمبلی کے ممبر بننے کے معنی کیا ہیں؟

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا؟

آپ نے شاید اس مسئلہ کی سنجیدگی (SERIOUSNESS) پر غور نہیں کیا ہوگا۔ آپ نے اتنا ہی سوچا ہوگا کہ ممبر بن جانے سے سوسائٹی میں عزت ہو جائے گی۔ افسروں، حاکموں کے ہاں رسائی ہو جائے گی۔ شاید کچھ مفاد بھی حاصل ہو جائیں۔ ممکن ہے کبھی وزارت، سفارت مل جائے — اس سے آگے بڑھے ہوں گے تو آپ نے یہ سوچا ہوگا کہ اس سے آپ عوام کی کچھ خدمت کر سکیں گے۔ پاکستان کی بہبود کے لئے کوئی قدم اٹھا سکیں گے۔ وقس علیٰ ہذا۔

لیکن جو کچھ ہم نے اوپر عرض کیا ہے اس کی روشنی میں آپ محسوس کریں گے کہ یہ سب مقاصد ثانوی ہیں۔ آپ کے ممبر بننے کا بنیادی مقصد کچھ اور ہے۔ اور یہ وہ مقصد ہے کہ جس کے حصول میں آپ نے ذرا سی کوتاہی یا بے احتیاطی برتی تو آپ کو خدا کے ہاں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

۳۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں اس مشکل کا یہ حل آجائے کہ ہم ہر زیر بحث قانون کے متعلق کسی "عالم دین" سے پوچھ لیا کریں گے اور اس کے مشورے کے مطابق عمل کر لیا کریں گے۔ اس طرح یہ ذمہ داری آپ کے سر سے ٹل جائے گی۔

ذمہ داری آپ کی ہوگی

لیکن یہ خیال غلط ہے۔ آپ کسی سے بھی مشورہ کیوں نہ لیں۔ حتیٰ کہ وہ مشورہ اسلامی مشاورتی کونسل کا بھی کیوں نہ ہو۔ اس کی حیثیت بہرحال ایک مشورہ کی ہوگی۔ فیصلہ آپ کا ہوگا، اور اسی بنا پر ذمہ داری بھی آپ ہی کی ہوگی۔

پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ آپ ایک ہی معاملہ کے متعلق مختلف فرقوں کے علماء سے مشورہ لیں گے تو ان میں سے ہر فرقے کے عالم کا مشورہ مختلف ہوگا — شیعہ کا کچھ اور، سُنّی کا کچھ اور۔ پھر سُنّیوں میں سے، اہلحدیث کا کچھ اور حنفیوں کا کچھ اور، نیز حنفیوں میں سے دیوبندیوں کا کچھ اور، بریلویوں کا کچھ اور۔ فرمائیے! آپ کس کے مشورے کو اسلام کے مطابق تصور کریں گے۔ لامحالہ اسی فرقہ کے عالم کے مشورہ کو جس فرقے سے آپ کا تعلق ہے لیکن آپ کسی ایک فرقہ کے لئے قانون تو نہیں بنا رہے؟ آپ ایسا قانون بنا رہے ہیں جو تمام فرقوں کے مسلمانوں

کے نزدیک اسلامی ہو، اور اس کا اطلاق سب مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔

۴۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے آپ کو معاملہ کی نزاکت، اور اپنی ذمہ داری کی شدت اور اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہو گا ـــ اور اگر آپ کا ایمان ہے کہ اس باب میں آپ خدا کے ہاں جوابدہ ہوں گے (اور یقیناً آپ کا اس پر ایمان ہو گا) تو ہمیں یقین ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری کے احساس سے کانپ اٹھے ہوں گے اور آپ یہ معلوم کرنے کے لئے مضطرب بیقرار ہوں گے کہ اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کی شکل کیا ہے؟ شاید آپ میں سے بعض حضرات یہ بھی سوچنے لگ گئے ہوں کہ ان حالات میں اسلامی کی راہ یہی ہے کہ انسان اس رکنیت (ممبرشپ) سے استعفیٰ دے کر امن سے ایک گوشے میں بیٹھ جائے۔

لیکن نہ آپ کو رکنیت سے استعفیٰ دینے کی ضرورت ہے، نہ اس قدر گھبراہٹ اور پریشانی کی کوئی وجہ۔ اس مشکل کا حل موجود ہے، البتہ اس کے لئے آپ کو تھوڑی سی محنت کرنی پڑے گی۔

اس مشکل کا حل

۵۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، پاکستان میں مختلف فرقے بستے ہیں ـــ شیعہ، سنی۔ سنیوں میں اہلحدیث، حنفی ـــ حنفیوں میں دیوبندی، بریلوی وغیرہ۔ ان سب کی احادیث الگ الگ ہیں اور فقہ الگ الگ۔ لیکن ان سب میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے قرآن کریم ـــ اسے ہر فرقہ کا مسلمان خدا کی کتاب اور دین میں آخری سند اور حجت تسلیم کرتا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ایسا قانون جس کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے، وہی ہو سکتا ہے جس کی بنیاد قرآن کریم پر ہو۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی اسلامی اور غیر اسلامی قانون کا معیار قرآن ہی کو قرار دیا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳)

جو تمہاری طرف، تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا اور سرپرستوں اور رفیقوں کی پیروی مت کرو۔

حتیٰ کہ اسی کی رو سے کفر اور ایمان کا فیصلہ ہوتا۔ سورہ المائدہ میں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو قرآن کے مطابق فیصلے نہیں کرتا۔ تو یہی لوگ کافر ہوتے ہیں۔

خود رسول اللہ کو بھی خدا کا یہی حکم تھا کہ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۶/۱۰۶)

"جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کرو"

رسول اللہ خدا کے حضور شکایت کریں گے تو یہی کہ میری امت نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ اور کسی چیز کے چھوڑ دینے کی شکایت نہیں کرینگے۔ سورہ الفرقان میں ہے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ——— (۲۵/۳۰)

اور رسول کہے گا کہ اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

لہٰذا اگر آپ قانون سازی کے معاملہ میں قرآن کریم کو اپنا معیار قرار دے لیں تو آپ خدا کے حضور اپنی اس اہم اور عظیم ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں۔

۶۔ ممکن ہے اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو (اور چونکہ عام طور پر ایسا کہا جاتا ہے اور ہم بچپن سے ایسا سنتے چلے آرہے ہیں اس لئے اس قسم کے خیال کا دل میں آجانا عین ممکن ہے) کہ قرآن کریم بڑی مشکل کتاب ہے اس لئے میں اسے کس طرح سمجھ سکتا ہوں۔ اس کے سمجھنے کے لئے کم سے کم "اٹھارہ علوم" کی ضرورت ہوتی ہے۔

قرآن کا سمجھنا مشکل نہیں

آپ اس خیال کو دل سے نکال دیجئے۔ قرآن کریم اس قسم کی کتاب نہیں۔ اسکے متعلق خود خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (۵۴/۱۷) "اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بڑا آسان بنایا ہے" وہ اپنے احکام کو آیات بَيِّنٰت کہتا ہے۔ یعنی بڑے واضح اور صاف۔ اس میں کوئی پیچ وخم نہیں (وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۔۱۸/۱) اس لئے نہ تو یہ مشکل ہے اور نہ ہی اس کے احکام کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ عائلی قوانین

عائلی قوانین کی مثال

کو لیجئے جن کا آج کل بڑا چرچا ہے اور جو غالباً عنقریب آپ کے سامنے آنے والے ہیں۔ ان میں پہلی شق نکاح کی عمر کے متعلق ہے۔ ان ضمن میں سورۂ نساء میں ہے وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (۴/۶) تم یتیموں کی آزمائش کرتے رہو حتیٰ کہ وہ نکاح کی عمر (بلوغت) کو پہنچ جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے بلوغت کو نکاح کی عمر قرار دیا ہے۔ لڑکا یا لڑکی کس عمر میں جاکر بالغ ہوتا ہے، اس کا فیصلہ ہر ملک کی آب وہوا وغیرہ کے لحاظ سے خود کیا جا سکتا ہے۔ شرط صرف بالغ ہونے کی ہے۔

ان قوانین میں دوسری شق اس امر کے متعلق ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناچاقی ہو جائے تو کیا خاوند کا جب جی چاہے بیوی کو طلاق دے سکتا ہے یا اس کے لئے کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے سورۂ نساء میں ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۔ (۴/۳۵)

اگر تم میاں بیوی میں ناچاقی محسوس کرو تو ایک ثالث میاں کے خاندان سے مقرر کرو اور ایک بیوی کے خاندان سے۔

اس سے ظاہر ہے کہ طلاق کا معاملہ میاں بیوی کے مابین، انفرادی طور پر حل کرنے کے لئے نہیں چھوڑا گیا بلکہ معاشرہ سے کہا گیا ہے کہ تم ایک ثالثی بورڈ مقرر کرو۔ جو ان میں مصالحت کی کوشش کرے۔ اگر مصالحت نہ ہو سکے تو پھر نکاح فسخ کیا جائے۔

تیسری شق یہ ہے کہ کیا مرد کو اجازت ہے کہ جس وقت اس کا جی چاہے ایک سے زیادہ بیویوں سے (چار تک) شادی کرلے یا اس کے لئے بھی شرائط مقرر کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں سورۂ نساء میں ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً ۔۔۔ (۴/۳)

اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم یتامیٰ کے معاملہ میں انصاف نہیں کرسکو گے تو تم ان عورتوں میں سے دو دو۔ تین تین۔ چار چار تک نکاح کرلو۔ اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم عدل نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رکھو۔

اس سے واضح ہے کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنے کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں۔

(i) یتامیٰ کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہ مل سکے۔ اور

(ii) تم عدل کرسکو۔

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہو، تو پھر دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ عربی زبان میں یتامیٰ کے معنی وہ بچے بھی ہیں جن کا باپ نہ رہے۔ اور وہ عورتیں بھی جو بغیر خاوند کے رہ جائیں (یعنی بیوہ عورتیں یا ایسی جوان لڑکیاں جو بغیر خاوند کے رہ جائیں) مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی معاشرے میں (مثلاً جنگ کی وجہ سے) ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ بہت سی عورتیں بیوہ ہو جائیں۔ ان کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں یا بالغ لڑکیاں جو غیر شادی شدہ ہوں۔ اور مردوں کی تعداد کم ہو تو ان بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی حفاظت اور پرورش کے لئے اس کی اجازت ہے کہ ایک سے زیادہ شادی کرلی جائے۔ یعنی دوسری شادی کی اجازت ان مخصوص حالات میں ان بےکس عورتوں کی حفاظت اور پرورش کے لئے ہے۔ وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ بیویوں اور ان بچوں کے ساتھ عدل کا سلوک کیا جاسکے۔ تعدد ازدواج کے سلسلے میں قرآن کریم میں یہی ایک آیت ہے۔ اس سے صاف

ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، عام قانون تو ایک وقت میں ایک بیوی (MONOGAMY) کا ہے لیکن معاشرہ میں جب اس قسم کے ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں تو ان کے حل کے لئے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت ہے، عدل کی شرط کے ساتھ۔

چوتھی شق یتیم پوتے کی وراثت کے متعلق ہے۔ قرآن کریم (سورۂ نساء کی آیات ۷ اور ۱۱) میں ہے کہ والدین کے ترکہ میں اولاد کا حصہ ہے۔

عربی زبان میں والد صرف باپ ہی کو نہیں کہتے بلکہ باپ دادا، پردادا وغیرہ اوپر تک، سب کو والد کہتے ہیں۔ اسی طرح اولاد کے معنی صرف بیٹا نہیں، بلکہ بیٹا۔ پوتا، پرپوتا وغیرہ نیچے تک سب اس میں شامل ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کا حکم یہ ہے کہ باپ۔ دادا وغیرہ کے ترکہ سے بیٹے پوتے وغیرہ کو حصہ ملے گا۔ اگر کسی شخص کا بیٹا موجود ہے تو اس بیٹے کو حصہ ملے گا۔ اگر بیٹا اس کی زندگی میں وفات پا چکا ہے اور پوتا موجود ہے تو اس پوتے کو حصہ ملے گا کیونکہ وہ دادا، اس پوتے کا والد ہے اور یہ پوتا اس دادا کی اولاد۔

ہم نے عائلی قوانین کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ آپ فرمائیے کہ اس سلسلے میں قرآن کریم کے احکام کے سمجھنے میں آپ کو کیا دقت پیش آئی ہے! قرآن کریم کے تمام احکام اسی قسم کے ہیں۔ اس لئے آپ اس سے نہ گھبرائیے کہ اگر آپ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا مخالف، تو آپ کو بڑی دقت پیش آئے گی۔ آپ کو زیادہ سے زیادہ یہ دقت پیش آسکتی ہے کہ آپ کو یہ بات بآسانی معلوم نہ ہو سکے کہ فلاں معاملہ کے متعلق قرآن کی کون سی آیات میں حکم آیا ہے۔ اس کے لئے اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ جو معاملہ آپ کے زیر غور ہو، ہم یہ بتا دیں گے کہ اس کے متعلق قرآن کریم کی کون کون سی آیات میں احکامات ملیں گے۔ آپ ان آیات پر خود غور کر کے فیصلہ کر لیں کہ اس باب میں قرآن مجید کی تعلیم کیا ہے۔ یہی ایک طریق ہے جس سے آپ اپنی اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکیں گے۔ آپ نے اسمبلی کے سابقہ سشن میں پارٹیوں کے احیاء کے متعلق جو قانون پاس کیا تھا وہ قرآن کریم کی تعلیم کے بالکل خلاف تھا۔ قرآن کی رو سے امت میں پارٹیوں کا وجود خدا کا عذاب اور مسلمانوں میں تفرقہ شرک کے برابر ہے، سوچئے کہ ان چیزوں کو قانونی سند عطا کر دینے سے آپ نے کتنا بڑا بوجھ اپنے سر پر لاد لیا ہے۔

ہم مدد کیلئے تیار ہیں

اس سلسلہ میں اتنا اور عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم محض نکاح اور طلاق وغیرہ کے متعلق ہی احکام نہیں دیتا۔ اس لئے صرف ان امور کے متعلق قوانین مرتب کر دینے سے آپ اپنے فریضے سے سبکدوش نہیں ہو جائیں گے۔ قرآن کریم ایک ایسا معاشرتی نظام (SOCIAL ORDER) قائم کرنا چاہتا ہے جس میں ہر فرد مملکت

قرآن کا معاشرتی نظام

کے ساتھ عدل ہو۔ عدل کے معنی اتنے ہی نہیں کہ عدالتوں میں مقدمات کے فیصلے قانون کے مطابق ہوں۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد کو زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے اور اپنی ذات کی نشوونما کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں اور کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات — روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ سے محروم نہ رہنے پائے۔ ان تمام ضروریات کا پورا کرنا مملکت کے ذمے ہو۔ اگر کوئی مملکت ایسا معاشرہ قائم نہیں کریگی تو وہ اسلامی نہیں کہلا سکے گی۔ اور جب تک ہماری مملکت صحیح معنوں میں اسلامی نہیں بنے گی، آپ اپنے فریضہ سے سبکدوش نہیں ہوسکیں گے۔ اس قسم کا معاشرہ محض قوانین کے زور پر وجود میں نہیں آسکے گا۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ہماری قوم کے افراد کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی واقع ہو جس سے اس

نفسیاتی تبدیلی

معاشرہ کا قیام ان کی زندگی کا نصب العین بن جائے۔ یہی ان کی تمام آرزوں کا محور اور ان کی جملہ مساعی کا مرکز ہو۔ اور اگر ضرورت پڑے تو وہ اس کی خاطر اپنی جان تک بھی دے دیں۔ یہی اسلامی آئیڈیالوجی ہے۔ اور اسی کی خاطر پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن یہ نفسیاتی تبدیلی — قلب و نگاہ میں ایسا انقلاب، صحیح تعلیم کے بغیر برپا نہیں ہوسکتا۔ یہ تعلیم اس وقت نہ "دنیاوی" اسکولوں اور کالجوں" اور نہ "دینی" مکتبوں اور دارالعلوموں میں ملتی ہے۔ اس کے لئے ہمیں اپنے پورے نظام تعلیم کو بدلنا

تعلیمی نظام

ہوگا اور اس کی بنیاد قرآن کریم کے ابدی حقائق اور غیر متبدل اصولوں پر رکھنی ہوگی۔ یہ اہم کام سب سے پہلے آپ کی توجہ کا محتاج ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں پہلے ہی اپنی ہی زندگی کے بڑے قیمتی پندرہ سال ضائع کردئے ہیں۔ اگر اس میں مزید تغافل برتا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری آیندہ نسلیں اس چڑیا کے بچے کی طرح ہوں گی جو بے پروبال گھونسلے سے نیچے گر پڑے اور پھر اسے ہندو کی نگاہ فریب وطنیت، مغرب کی مادیت، یا روس کی اشتراکیت — غرضیکہ جو فولادی پنجہ چاہے اچک کرلے جائے۔

یہ ہیں برادرانِ عزیز! بنیادی طور پر وہ چند اہم مقاصد جن کی خاطر آپ کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ اس سلسلہ میں کئی اور باتیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ہم سردست انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان مقاصد کو بروئے کار لانے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ آپ اپنے خدا سے کہہ سکیں کہ ملت نے جو امانت ہمارے سپرد کی تھی ہم نے اس کی پوری پوری حفاظت اور پاسداری کی۔ واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔ والسلام۔

حقائق و عبر

ابدی مایوسی

آج کل حضرات علمائے کرام کی باہمی تکفیر کی آندھی جس شدت سے چل رہی ہے اس نے ہر گوشے میں کھڑکھڑاہٹ پیدا کر دی ہے، اور اسے روکنے کے لئے ہر طرف سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں لیکن ان میں سے کوئی اس بات پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتا کہ اس کفر سازی کا اصل سبب کیا ہے؟ تکفیر کے اس جھگڑے کو جذباتی اپیل سے روکنے کی کوشش کرنا علامتِ مرض کا علاج ہو تو ہو، علتِ مرض کا علاج نہیں۔ اس مرض کی علت امت میں فرقوں کا وجود ہے۔ اور جب تک یہ علت موجود ہے مرض کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ جب عقیدہ یہ ہو کہ امت میں ۷۳ فرقے ہوں گے جن میں سے ۷۲ جہنمی ہوں گے اور صرف ایک ناجی۔ تو اس کا فطری نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور باقی فرقوں کو گمراہ ثابت کرے۔ اسی کا نام تکفیر ہے۔ لہٰذا جب تک فرقے نہیں مٹتے، کفر سازی کی ٹکسال بند نہیں ہو سکتی۔

لیکن فرقوں کے سلسلے میں بدقسمتی سے مسلمان اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں انسان پر ابدی مایوسی چھا جایا کرتی ہے مثلاً ماہنامہ میثاق (لاہور) اپنی ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں فتنۂ تکفیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے

> اب جو فرقے مسلمانوں میں پیدا ہو چکے ہیں ان میں سے کسی کو مٹا دینا کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی مٹے گا تو خدا ہی کے مٹانے سے مٹے گا۔ اب تو یہ دعا کرنی چاہیئے کہ ہمارے اندر کسی اور فرقے کا اضافہ نہ ہو۔

اس ضمن میں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے جس پر غور کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ ۙ وَ
هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ——————— (۱۶/۶۴)

اور ہم نے یہ کتاب تم پر نازل ہی اسلئے کی ہے کہ لوگ جن باتوں میں اختلاف کرتے ہیں تم ان کے ذریعہ ان کی وضاحت کر دو۔ اور جماعت مومنین کے لئے یہ ہدایت اور رحمت کا موجب بنے۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کا بنیادی مقصد، اختلافات کو رفع کرکے، ہدایت اور رحمت کا موجب بننا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا قرآن میں اب بھی یہ صلاحیت باقی ہے یا نہیں کہ یہ ہمارے اختلافات کو رفع کر سکے یا یہ صلاحیت کسی خاص زمانے تک تھی اور اب یہ (معاذ اللہ) اس سے عاری ہو چکا ہے؟ اگر قرآن میں یہ صلاحیت اب بھی موجود ہے تو پھر یہ کہنا کہ ہمارے فرقوں کے اختلافات رفع ہی نہیں ہو سکتے۔ کیا بالفاظ دیگر اس امر کا اعلان نہیں کہ ہم اپنے اختلافات مٹانے کے لئے قرآن کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے؟

اور اگر آپ کا ایمان یہ ہے کہ اب (معاذ اللہ) قرآن میں اس کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی تو پھر مرزا غلام احمد کا یہ دعوے کہ دنیا کو ایک نئے نبی کی، اور بہاء اللہ صاحب کا یہ فرمان کہ انسانوں کو ایک نئی کتاب کی ضرورت تھی، درست ثابت ہوگا!

سوچئے کہ قرآن سے بعد اور جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اس سے دابستگی نے مسلمان کو کس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ قرآن میں یہ صلاحیت ہے ـــ اور ہمیشہ تک یہ صلاحیت رہے گی ـــ کہ وہ مسلمانوں کے ہی نہیں بلکہ عالم انسانیت کے اختلافات مٹا دے۔ لیکن اختلافات تو انہی کے مٹیں گے جو اس مقصد کے لئے قرآن کو اپنا راہ نما بنائیں۔

دوسرا سوال اس سلسلے میں یہ سامنے آتا ہے کہ فرقوں کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

دیکھنا! تم نے کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے۔ (اس سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ) ہر گروہ اپنے اپنے عقیدہ اور مسلک میں مگن رہتا ہے۔

دوسرے مقام پر ـــ نبی اکرمؐ سے ارشاد ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ـــ (۶/۱۵۹) جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے فرقے مٹ ہی نہیں سکتے۔ اور انہیں اسی طرح فرقوں میں بٹے رہنا ہے تو پھر قرآن کریم کے مندرجہ بالا ارشادات کی روشنی میں ان مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہوگی؟

۲۔ غلامی کی لعنت

اخبارات (پاکستان ٹائمز ۸ نومبر ۱۹۶۲ء) میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حکومت سعودی عرب نے اپنے ہاں غلامی کو ختم کر دیا ہے۔

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

فالحمد للہ علیٰ ذالک

دنیا کو اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اسلام کے اصولوں کی طرف آئے۔ جو قومیں ان اصولوں کو بطیبِ خاطر اپنا لیتی ہیں وہ آسودگی میں رہتی ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتیں انہیں زمانے کے تقاضے مار مار کر ادھر لے آتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمان قومیں سب سے آخر میں اس طرف آتی ہیں — اور وہ بھی زمانے کے تھپیڑوں سے مجبور ہو کر۔ آپ غور کیجئے دنیا کی غیر مسلم قوموں نے غلامی کی لعنت کو کب سے اپنے ہاں سے دور کر دیا اور حجاز مقدس کی سرزمین سے یہ خبر اب آ رہی ہے۔ (خدا کرے کہ اس کی تردید نہ ہو جائے)۔ ابھی مسلمانوں کے ممالک میں کئی ایک اور لعنتیں باقی ہیں — ملوکیت — سرمایہ داری۔ مذہبی پیشوائیت نسل پرستی وغیرہ — یہ بھی ایک دن ختم ہو کر رہیں گی۔ لیک بعد از خرابیٔ بسیار۔

لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ حجاز سے غلامی ختم کرنے کے ساتھ ساتھ، مملکت پاکستان کے مذہبی حلقوں سے یہ آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ جب اس مملکت میں شریعت کے احکام نافذ ہوں گے تو یہاں غلامی کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنایا جائے گا، اور (چار بیویوں کے علاوہ) زرخرید باندیوں کو بلا حد و نہایت گھروں میں ڈالا جائے گا۔ آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں!

مفت

مجرب دوا — برائے — دمہ۔ درد گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ: — شیخ الرئیس لیبارٹری

متصل گنیش کھوپرا ملز لارنس روڈ — کراچی۔

نوٹ:- جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

بابِ المراسلات

اسلام میں جھوٹ بولنے کی اجازت

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ:-

طلوعِ اسلام کی حالیہ اشاعت میں آپ نے عنوانِ بالا کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس سے بہت سے شکوک رفع ہو گئے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ایک نکتہ کی ذرا اور وضاحت کی ضرورت تھی۔ آپ نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ جھوٹ بول کر جان بچانے کی اجازت ان کمزور دل مسلمانوں کے لئے ہے جو مخالفین کی اذیتیں برداشت نہ کر سکیں۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس قسم کے کمزور دل (بلکہ کمزور ایمان) رکھنے والوں کا درجہ ان لوگوں کے برابر ہو گا جو اذیتیں برداشت کرتا تو ایک طرف جان دے دینا بھی گوارا کر لیتے ہیں لیکن اپنے ایمان کے خلاف زبان پر ایک حرف تک نہیں لاتے۔ یہی وہ صاحبانِ عزیمت ہیں جن کی قربانیوں کے صدقے دنیا میں حق و صداقت کا علم بلند رہا ہے، اور رہیگا۔ کمزور ایمان والوں کو اسلامی معاشرہ بس اپنے اندر برداشت کرے گا لیکن ان کے پیرو کوئی ذمہ داری کا کام نہیں کیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیجئے کہ انہیں مجرم نہیں سمجھا جائے گا۔ لیکن معاشرے میں وہ کسی عزت اور توقیر کے مستحق نہیں ہوں گے، تاآنکہ وہ اپنے کردار سے ثابت نہ کر دیں کہ ان کی وہ کمزوری رفع ہو گئی ہے۔ قرآن مجید تو ان لوگوں کو جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے ان کے برابر تسلیم نہیں کرتا جو اس سے پہلے اسلام لائے تھے، چہ جائیکہ وہ ان لوگوں کو جو تکالیف سے ڈر کر اپنے ایمان کو چھپاتے پھریں صاحبِ عزیمت کے برابر جگہ دے دے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کمزور ایمان والوں کو اس قسم کی اجازت بھی خاص استثنائی حالات میں ہی دی جا سکتی ہے۔ ورنہ جو شخص اس مسلک کو اپنا شیوہ ہی بنا لے اور اسے دین کا ایک اصول سمجھ لے، اس کے لئے اسلامی معاشرہ میں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی مثال قرآن مجید میں ایک اور بھی ہے۔ سورۂ والنجم میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ـــــ (۵۳/۳۲) "وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں۔ سوائے ایسی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کے جو یوں ہی بلا ارادہ سرزد ہو جائیں" اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کی پرواہ ہی نہ کرے۔ اور انہیں اپنی زندگی کا شیوہ بنا لے ایسی زندگی صحیح مومن کی زندگی نہیں ہو سکتی ہے۔ مومن کی زندگی تو یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۷/۲۰۱) وہ تمام برائیوں سے بچتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شیطانی خیال یوں ہی گھومتے پھرتے بھی ان کے دل میں آجاتا ہے تو وہ فوراً خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اور ان کی نگاہوں کے سامنے یکایک ایک روشنی آجاتی ہے۔ لہٰذا جھوٹ کو مذہب کا جزو بنا لینا، اور اس مسلک کو دنیا کے سامنے تحریہ پیش کرنا اسلام میں کبھی جائز قرار نہیں پا سکتا۔"

طلوع اسلام ہمیں اس سے پورا پورا اتفاق ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس سے بھی یہی مراد تھی لیکن چونکہ وہ شذرہ مختصر سا تھا۔ اس لئے اس میں اس قسم کی تفاصیل نہیں دی گئی تھیں ورنہ قرآن کریم سے اس موضوع پر بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے ناپختہ کردار کے لوگ معاشرہ کے لئے تقویت کا باعث بننے کے بجائے نقصان اور خطرہ کا موجب ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ اس مسلک کو اپنا شیوہ قرار دے لیں تو رفتہ رفتہ ان کی نفسیاتی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ عملاً ان میں اور منافقین میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

علامہ احمد امین مصری کی تاریخی و علمی پیشکش

فجر الاسلام

جسے مولانا عمر احمد عثمانی نے اردو زبان کا لباس پہنایا۔
اسلام کی سرگزشت کے سلسلۂ دراز کی پہلی کڑی۔

اس دور کی علمی حرکات اور تہذیبی کیفیات کا تفصیلی جائزہ!

جب آفتاب اسلام کی ضیا باریاں بزم انسانی کو نصیب ہوئیں۔

ضخامت ۴۰۰ صفحات ـــــ قیمت آٹھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

پرویز صاحب کا کراچی کا دورہ

منزل کی طرف ایک اور قدم

(از۔ ابو عاکف)

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

یہ ہے زندگی کا عام تصور ـــــ یا یوں کہہ لیجئے کہ ہماری زندگی اس دور میں اسی انداز سے گزر رہی ہے مگر کبھی کبھی جہانِ گزراں کو اپنی رفتار اور اپنا انداز بدلنا پڑتا ہے ـــ کسی بڑے مقصد کے سہارے زندگی زیادہ بامعنی ہو جاتی ہے۔ اور اپنے گہرے مفہوم سے ہمیں آشنا کر دیتی ہے۔

زندگی کے دن اور لمحے یوں ہی بیت رہے تھے کہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں پرویز صاحب نے اطلاع دی کہ "میں نومبر میں کراچی آسکوں گا" ـــ یہ چھوٹا سا پیغام، نشاطِ دل و جاں کا سبب بنا ـــ اجتماعات کے لئے موضوعات سوچے جانے لگے ـ بکھرے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے ملنے لگے ـ جی ہاں کراچی میں افراد کی تعمیری قوتیں بکھری رہتی ہیں ـــ شاید یہ دائمی طور پر مجتمع ہو سکیں تو انتشار کی قوتیں کسی غار میں چھپ جائیں ـــ یہ صرف کراچی کا المیہ نہیں بلکہ ہر بڑے تجارتی اور صنعتی شہر کا المیہ ہے ـ آج کا ہر بڑا شہر ایک تنہا ہجوم ہے۔ جہاں افراد کے دلوں میں حوصلوں اور تمناؤں کی شمعیں فروزاں نہیں رہتیں بلکہ جھلملاتی رہتی ہیں ـــ اسی لئے تو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جب تمہارے شہروں کی آبادیاں حد سے بڑھنے لگیں تو دوسرے شہر لسیالو ـــ بڑے شہروں کی تہذیبی قوت کم ہو جاتی ہے۔

لیجئے میں تمہید ہی میں الجھنے لگا ـــ میں کہہ یہ رہا تھا کہ پرویز صاحب نے ادھر خوشخبری بھیجی اور ادھر بکھرے ہوئے

افراد ایک رشتہ سے منسلک ہو گئے ــــ وہ رشتہ جو ہر رشتے سے زیادہ قوی اور مستحکم ہے ــ جو ہر امتیاز سے انسانی شخصیت کو بلند کر دیتا ہے۔ یہ رشتہ اقامت دین اور پیغام قرآنی کی ترویج کا رشتہ ہے۔ اسی رشتہ کے سبب پرویز صاحب یہاں عزیز ہیں ــ عزیز تو پیغام ہے، جو کسی فرد کو بھی عزیز بنا دیتا ہے۔

شفیع صاحب، انور صاحب، حافظ برکت اللہ صاحب، مرزا صاحب، ملک وحید صاحب ــــ یہ سب (پہلے سے بھی زیادہ) فعال اور سرگرم ہوئے ــــ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک نظام ربوبیت اور اسلامی معاشرہ کا قرآنی تصور پیش کیا جا سکے۔ پرویز صاحب کے دورہ کراچی کی تفصیلات مرتب کی گئیں ــــ تاریخوں کا تعین کیا گیا "۱۲ نومبر ۱۹۶۲ء سے ۲۲ نومبر ۱۹۶۲ء تک۔"

۱۲ نومبر اور آخر ۱۲ نومبر آگیا ــــ ہوائی اڈہ پر پیارے رفیق اور دوست جمع تھے ــــ جہاز کے آنے کا وقت سب کو معلوم تھا۔ مگر آپس میں باتیں کرتے کرتے نگاہیں فضا میں کچھ تلاش کرنے لگتیں۔ محبت، منطق کی غلام نہیں ہوتی۔ اس کے آداب ہی کچھ اور ہیں۔ اور پھر دور افق میں ایک نقطہ نظر آیا .... یہ نقطہ دیکھتے ہی دیکھتے سفید ہیکر میں ڈھل گیا۔ یہ پی آئی اے کا طیارہ تھا ــــ طیارہ، جو تسخیر کائنات کی ایک شہادت ہے ــ نہ جانے اس لمحے مجھے طیارہ کی آمد اور کسی عظیم تحریک کے درمیان مماثلت کا احساس کیوں ہوا۔ ہر بڑی تحریک یوں ہی ایک نقطہ کی طرح انسانی زندگی کے افق پر نمودار ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تفصیلات اور نتائج ایک محسوس قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔

طیارہ چکر کاٹ کر ہوائی میدان پر اترا۔ تھوڑی دیر کے بعد دریچہ کھلا ــــ مسافر اترنے لگے ــ یوں جیسے ذہن کا دریچہ کھلتا ہے اور کوئی نیا خیال ہمیں اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ پرویز صاحب اپنی آشنا اور مہربان مسکراہٹ کے ساتھ سیڑھیوں سے اترنے لگے۔ ان کا ہاتھ بلند ہوا۔ ہم میں سے ہر ایک نے یہی محسوس کیا، "یہ سلام میرے لئے ہے" جذبات کی یہ صورت اور کیفیت یک طرفہ نہیں ہے۔ پرویز صاحب کے الفاظ میں کراچی میں کتنے ہی چہرے اور آوازیں ایسی ہیں جو ان کے لئے جنت نگاہ اور فردوس گوش ہیں۔

کراچی باب الاسلام ہے ــــ برصغیر میں مسلمان فاتحوں کے قدموں کو سب سے پہلے بوسہ دینے کا شرف اسی سرزمین کو حاصل ہوا۔ صدیوں کی تاریخ رواداری میں کون دہرا سکتا ہے۔ بیتے ہوئے سو سال پر نظر ڈالئے۔ قائداعظمؒ اسی شہر میں پیدا ہوئے۔ اسیری کے قید و بند میں جکڑے ہوئے اسلام کے سپاہی مولانا محمد علیؒ نے اسی شہر کے خالق دینا ہال میں فرنگی سامراج کو دعوت مبارزت دی، ... پاکستان کے ہلالی پرچم کو پہلی بار کھلتے ہوئے اور ہوا میں لہراتے ہوئے اسی شہر نے دیکھا۔ ہماری ایک عظیم قومی امانت محمد علی جناحؒ اسی خاک میں محو استراحت ہے۔ قیام پاکستان کے بعد

طلوع اسلام کی قرآنی آواز کو اسی شہر کے دھڑکتے ہوئے دل نے پہلی بار سنا اور یہاں کی ہواؤں نے تا برقی کی طرح اس آواز کو سارے ملک میں پھیلا دیا۔ اسی شہر میں نہ جانے کتنی راتوں نے غلام احمد پرویز کو معارف قرآنی کی جلدیں لکھتے ہوئے دیکھا —— وہ راتیں جو اس کے علم و بصیرت اور خلوص کی ہمیشہ گواہ رہیں گی —— وہ راتیں جو ایک نئی شمع کی درخشاں کرنوں میں بدل گئیں ہیں —— وہ شب ستاروں کی تنگ تابی ہی تو صبح روشن کی دلیل بنتی ہے۔

میں اس طویل جملۂ معترضہ کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں، مگر آپ جانتے ہی ہیں کہ جذباتی لمحوں میں

ع گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا

پرویز صاحب، جب رفیقوں کے حلقہ میں پہنچے تو ذہن اقبال کا یہ مصرع دہرانے لگا۔

ع ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

نگاہوں میں محبت، ہونٹوں پر تبسم، باتوں میں بادِ صبا کی نرمی، ہاتھوں کی گرفت میں گرمی ...... ہر ایک سے یوں ملے جیسے اسی سے ملنے کے لئے یہ سفر کیا ہو —— جو دوست، ساتھی اور رفیق وہاں موجود نہ تھے ان کے بارے میں پوچھتے رہے —— میں حیران تھا کہ یہ آدمی سبھوں کو اتنی آسانی کے ساتھ کیسے یاد رکھتا ہے؟ —— پیچھے یہ سطریں لکھتے لکھتے وجہ بھی میرے ذہن میں آگئی —— یہ سارے ساتھی قرآنی معاشرہ کی راہوں کے راہی ہیں۔ انہیں کیسے بھولا جا سکتا ہے۔

ہوائی اڈہ سے یہ قافلہ شفیع صاحب کے ہاں پہنچا۔ پرویز صاحب ..... باتیں کرتے رہے ..... آرام کا خیال بھی ان کے ذہن میں نہ آیا —— ذاتی باتوں کی رو میں اصولی مسائل بھی آتے رہے —— ویسے بھی ذاتی اور انفرادی زندگی کو بنیادی اصولوں سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اور یوں باتوں باتوں میں پریس کانفرنس کا وقت آگیا۔

پریس کانفرنس

شام کو پریس کانفرنس میں پرویز صاحب کی صحافیوں سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے آغاز سے پہلے ہی سوالات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ملک کے ایک بڑے اخبار کے نمائندے نے بڑے گرم اور تند و تیز لہجے میں بات شروع کی —— کوئی سیاسی رہنما ہوتا تو شاید خود بھی اسی لہجہ میں بات کرتا۔ لیکن قرآن نے تو قول حسن اور نرم کلامی کا حکم دیا ہے —— لہجہ جذبات کی نوعیت کا اظہار ہوتا ہے۔ پرویز صاحب کے لہجے نے اس تندی و تیزی کو دوستی میں بدل دیا۔ دوسرے دن اسی نمائندے نے پریس کانفرنس کی روئیداد سب سے زیادہ تفصیل اور سلیقہ سے پیش کی۔

اس پریس کانفرنس کا مقصد ملک کے سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ کی طرف صحافیوں اور پاکستان کے ارباب فکر و نظر کی توجہ مبذول کرانا تھا۔ "ارباب اقتدار نہیں بلکہ ارباب فکر و نظر" —— جس دن ہماری اجتماعی زندگی کے افق پر فکر و نظر کا سورج طلوع ہوگا۔ اسی دن ارباب اقتدار کو صاحبان فکر و نظر سے تعاون کرنا ہی ہوگا......

پرویز صاحب نے پاکستان کے سب سے اہم مسئلہ کی نشان دہی کم و بیش ان الفاظ میں کی۔

۔ اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ کیا ہے ؟ اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے اہم مسائل ایسے ہیں جن سے اس وقت پاکستان دوچار ہے۔ اور وہ ہماری فوری توجہ کے محتاج بھی ہیں لیکن یہ مسائل ہنگامی ہیں۔ پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ میرے نزدیک یہ ہے کہ یہاں اسلامی قوانین کس طرح مرتب کئے جائیں ؟ پاکستان کے جدید آئین میں یہ شق رکھ دی گئی ہے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو اسلام کے خلاف ہو لیکن اس سلسلہ میں جو عملی مشکلات سامنے آئیں گی ان کی طرف نہ آئین میں توجہ دی گئی ہے اور نہ ہی ملک کے کسی گوشے میں اس سوال پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ سوال ایسا ہے جو قدم قدم پر ہمارے سامنے آتا ہے اور جس پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہے۔

آئین پاکستان کی رو سے قانون سازی کی آخری اتھارٹی نیشنل اسمبلی (باستثناء صدر مملکت) مقرر کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں اگرچہ ایک اسلامک کونسل بھی متعین کی گئی ہے لیکن اس کی حیثیت محض مشاورتی ہے۔ دوسری طرف اسمبلی کے منظور کردہ قانون کو عدالت عالیہ میں بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ بدیں حالات جو قانون اسمبلی پاس کرے گی وہ آئینی طور پر اسلامی متصور ہوگا۔

لیکن ہمارے مذہبی حلقوں سے یہ آوازیں ابھی سے بلند ہونا شروع ہو گئی ہیں کہ اگر اسمبلی نے کوئی ایسا قانون پاس کر دیا جو ان حضرات کے نزدیک اسلام کے خلاف ہوا تو یہ اسے قانون تسلیم نہیں کریں گے۔ اور مسلمان اس قانون کے بجائے اسلامی شریعت کی اطاعت کریں گے یعنی ان احکام کی اطاعت جنہیں یہ حضرات اسلامی قرار دے دیں۔ اس صورت حالات کے جس قدر خطرناک نتائج ہو سکتے ہیں ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

بعض حلقوں کی طرف سے اس مشکل کا حل یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ ایک علماء کا بورڈ بنا دیا جائے جس قانون کے متعلق وہ کہہ دے کہ اسلام کے مطابق ہے اسے ملک میں نافذ کر دیا جائے جس کی تصدیق وہ نہ کرے اسے مسترد کر دیا جائے۔ اس تجویز کے متعلق اول تو یہ دیکھئے کہ اس میں قانون سازی کا اقتدار اعلیٰ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھوں میں رہتا ہے، اسے تھیاکریسی کہتے ہیں اس طرز حکومت کے نتائج جس قدر انسانیت سوز ہوتے ہیں اس پر تاریخ شاہد ہے۔ اس میں نہ جمہوریت باقی رہتی ہے نہ آزادی۔ نہ کسی پارلیمان یا اسمبلی کی ضرورت ہوتی ہے نہ قانون سازی کے لئے کسی آئین و دستور کی۔ جو کچھ یہ حضرات کہہ دیں وہ قانون بن جائے۔ اور حکومت کا کام صرف یہ ہو کہ وہ اس قانون کو نافذ کرائے۔

پھر یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ خود ان حضرات (علمائے کرام) میں اس قدر باہمی اختلافات ہیں کہ جو قانون ایک فرقے کے نزدیک عین مطابق اسلام ہے دوسرا فرقہ اسے یکسر اسلام کے خلاف قرار دیتا ہے۔ ان میں کے دو اہم فرقے (اہلحدیث و حنفی حضرات) اس پر بھی متفق نہیں کہ بیوی کو طلاق دینے کا اسلامی طریقہ کون سا ہے۔ خود حنفیوں میں دیوبندی اور بریلوی حضرات جس بری طرح ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کر رہے ہیں وہ سب کے سامنے ہے۔ بدیں حالات کیا اس کی توقع کی جا سکتی

ہے کہ مختلف فرقوں کے علماء پر مشتمل بورڈ ایسے قوانین مرتب کر سکے گا جو ان سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی ہوں اور جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ یہ قطعاً ناممکن ہوگا۔ جو حضرات اس پر بھی متفق نہیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں وہ تمام مسلمانوں کے لئے متفق علیہ قوانین کیسے بنا سکیں گے؟ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں سے کسی ایک فرقہ کا قانون دوسرے فرقوں پر زبردستی ٹھونس دیا جائے (جیسا کہ بعض حلقوں کی طرف سے تجویز کیا جا رہا ہے) تو سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے کسی کی تنقیص مقصود نہیں۔ یہ صرف ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک ہم ٹھوس حقائق کا سامنا نہیں کریں گے ہمارا کوئی معاملہ بھی سلجھ نہیں سکے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس مشکل کا بالآخر حل کیا ہے؟ اس کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ کوئی ایسی قدر مشترک معلوم کی جائے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو اور اسے سب آئین میں سند اور حجت تسلیم کرتے ہوں۔ آپ جس زاویہ سے چاہیں اس مسئلہ پر غور کر لیں۔ آپ اس کے سوا کسی دوسرے نتیجہ پر نہیں پہنچ سکیں گے کہ یہ قدر مشترک قرآن کے سوا اور کوئی نہیں۔ ہمارے مختلف فرقوں کی احادیث الگ الگ ہیں ان کی فقہ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن قرآن کریم سب کا ایک ہے لہٰذا اس مشکل کا حل یہ ہے کہ قرآن کریم کو قانون کی بنیاد تسلیم کر لیا جائے۔

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم کی تعبیرات میں بھی اختلاف ہے۔ یہ اعتراض ایک بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جس کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس کے احکام نہایت صاف۔ واضح۔ بین اور محکم ہیں۔ اس نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ آپ سوچئے کہ جس کتاب کا دعویٰ یہ ہو (اور یہ دعویٰ خود خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو) اس کے متعلق یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ایک حکم کے متعلق زید کو کچھ تعبیر دے دیگی۔ اور بکر کو کچھ؟ یہ تو (معاذ اللہ) اس کتاب کا بڑا نقص ہوگا۔ لہٰذا بات یہ نہیں کہ قرآن کریم کے احکام ایسے ہیں جن کی مختلف تعبیرات ہو سکتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ مختلف فرقے اپنے اپنے ہاں کے احکام کو محکم مانتے ہیں اور قرآن کو کھینچ تان کر ان کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کا نام رکھتے ہیں قرآن کی تعبیرات۔ اگر قرآن کو محکم مان لیا جائے تو اس کے احکام کی مختلف تعبیریں ہو نہیں سکتیں۔

یہ ہے میرے نزدیک اس اہم ترین مشکل کا حل۔ واضح رہے کہ میں نہ (معاذ اللہ) حدیث کا منکر ہوں نہ فقہ کا۔ لیکن میں علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھتا ہوں کہ امت میں وحدت پیدا کرنے اور اپنے یہاں پھر سے وہی نظام رائج کرنے کے لئے جو محمد رسول اللہ والذین معہ میں وجہ سعادت انسانیت تھا اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں۔ اگر کسی صاحب کے ذہن میں اس کا کوئی اور طریقہ ہو تو میں اس پر غور کرنے کے لئے بخوشی تیار ہوں۔ یاد رہے کہ ہماری تاریخ میں پہلی بار یہ سوال سامنے

آیا ہے کہ مملکت کے لئے ایسے قوانین مرتب کئے جائیں جو اسلامی بھی ہوں اور جن کا اطلاق عام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہو سکے۔ اس لئے اس مسئلہ کا حل خاصا غور و تدبر بھی چاہتا ہے۔ اور جرأت اور ہمت بھی۔

اسلام کا دعویٰ ہے (اور اس دعویٰ پر ہمارا ایمان ہے) کہ یہ دنیا کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ دنیا اس وقت سخت مصیبت میں مبتلا ہے۔ امریکہ اور روس کے دو متضاد نظاموں کی کشمکش نوع انسان کو صفحۂ ارض سے مٹا دینے پر تلی ہوئی ہے۔ دنیا کو اس عذاب سے صرف اسلام بچا سکتا ہے ضرورت تھی کہ ہم اس خطۂ زمین میں اسلام کو ایک عملی نظام کی شکل میں رائج کر کے دنیا کو دکھا سکتے کہ اس کی مشکلات کا حل کس طرح پیش کرتا ہے لیکن ہم ہیں کہ دنیا کی مشکلات کا حل پیش کرنا تو ایک طرف خود اپنے فروعی اختلافات کو بھی رفع نہیں کر سکتے۔ دنیا میں اسلام کی سربلندی کا کیسا قیمتی اور موقع تھا جسے ہم باہمی اختلافات کی وجہ سے یوں ضائع کر رہے ہیں۔

اس وضاحت میں کتنی دردمندی ہے۔ اب کوئی اپنے دل کے کان ہی بند کر لے تو اس کا کیا علاج؟ — دنیا کے دوسرے ملک تو مہتاب و مریخ پر کمندیں پھینک رہے ہیں اور ہم کلمہ گو مسلمانوں کی "کافر سازی" میں مصروف ہیں۔ خالم بن اگر یہی باہمی کشمکش رہی تو شاید کسی سعدی کو ہمارا بھی مرثیہ لکھنا ہوگا۔ اور انہی الفاظ میں کہ

"آسماں راحق بود گر خوں ببارد برزمیں"

لیکن شاید ہمیں اپنے مرثیے کے لئے کوئی دوسرا سعدی بھی نہ مل سکے۔!!

۱۳ر نومبر

اس بار پرویز صاحب کے قیام کراچی کی تفصیلات مرتب کرتے ہوئے اس بات کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے کہ کہ جلسوں اور اجتماعات کے ساتھ ساتھ ملاقاتوں اور نجی محفلوں کے لئے بھی وقت نکالا جا سکے۔

۱۳ر نومبر کو پرانے ساتھیوں اور رفیقوں کے علاوہ کتنے ہی دوسرے لوگ پرویز صاحب سے ملنے آئے — وہ لوگ جن کے دلوں میں سوالات کانٹوں کی طرح چبھتے رہتے ہیں — جن کی روحیں بے تاب و بے چین ہیں — وہ جنہیں کسی صورت سکون نہیں ملتا اور جو سکون کے لئے مضطرب ہیں — آج کے حالات میں جب "مفادات عاجلہ" کی تکمیل و تسکین میں ہماری آبادی کا بڑا حصہ اپنے آپ سے بے خبر ہو چکا ہے۔ یہ بے چین روحیں "کل" کے لئے ایک خوش آئند وعدہ ہیں — کم سے کم مجھے تو یقین ہے کہ ان کے نالۂ نیم شب کا گداز اور ان کی روح کی بے چینی رائیگاں نہ جائے گی۔

پرویز صاحب سے ملنے والوں میں کالجوں کے پروفیسر بھی تھے اور طلبا بھی۔ وکیل بھی اور وہ مظلوم طبقہ بھی

جنہیں بہت سے حامیانِ دینِ مبین "جنسِ تجارت" اور "شکمِ بستر" سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ جن کی زندگی ایک عذابِ مسلسل ہے۔ جن کے حقوق کی پامالی کے لئے بڑے بڑے جلسے ہو رہے ہیں۔ اور ان جلسوں میں آدمؑ کے بیٹے تالیاں بجا بجا کر اپنی فتح مندی کا اظہار کرتے ہیں۔

ہماری خواتین کتنے اندیشوں میں مبتلا ہیں؟ کسی کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ یونین کونسل کے سامنے شوہر کی دوسری شادی کے لئے رضامندی کا بیان دے دے۔ کسی کی بچی کو شوہر روز پیٹتا ہے۔ ایک پچاس سالہ خاتون کو اس کے شوہر نے گھر سے نکال دیا ہے۔ اس غریب کو اپنی تو فکر اتنی نہیں جتنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی ہے۔ یہ غم اسے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے اس کا جواب خود اپنے دل سے لیجئے۔

۱۳ر نومبر کو ایسے ہی کئی قصے اور مسئلے میرے سامنے پرویز صاحب سے بیان کئے گئے۔ دل اتنا بوجھل ہو گیا کہ میں چپ چاپ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ایک گہری فکر میں ڈوبے ہوئے۔

کٹرک ہال کا اجتماع

اسی شام ۷ بجے شام کٹرک ہال صدر میں پہلا اجتماع منعقد ہوا۔ جلسہ گاہ برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی اور یہ جگمگاہٹ اس دور کا پیش خیمہ معلوم ہو رہی تھی۔ جب "زمین اپنے پروردگار کے نور سے منور ہو جائے گی"۔ جب ہمارا معاشرہ ارضی جنت بن جائے گا۔ ایسی جنت جہاں کوئی فرد بنیادی ضروریاتِ زندگی اور اسبابِ نشوونما سے محروم نہ رہے گا۔ اس روشنی کے پیچھے ملک سعید صاحب کا ذوقِ جمال اور قوتِ عمل پنہاں تھی۔

سات بجے سے بہت پہلے کٹرک ہال سامعین سے بھر چکا تھا۔ اتنا ہجوم اور مکمل خاموشی۔ حالانکہ ابھی مقرر آیا بھی نہ تھا۔ سات بجے سے کچھ پہلے پرویز صاحب آ گئے اور ٹھیک سات بجے جلسہ شروع ہو گیا۔ میاں عبدالخالق نے کرسیِ صدارت سنبھالی۔ میاں صاحب کی شخصیت عجیب و غریب ہے۔ باتیں سنئے تو بچوں کی سی معصومیت، کام کرتے دیکھئے تو اپنی جوانی پر شرم آنے لگے۔ اور صورت دیکھئے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سفید بال ہمیشہ سے ان کے سر پر ہیں۔ میں کبھی کبھی ان سے یہ پوچھنے کی خواہش اپنے دل میں پاتا ہوں کہ کیا کبھی آپ کے بال سیاہ بھی تھے!۔

حافظ احمد عبدالعزیز نے تلاوتِ قرآن کی۔ اس کے بعد محمد شفیع صاحب نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام نے پرویز صاحب کا تعارف پیش کیا۔ اس تعارف میں معارف القرآن کی جلدوں کا ذکر اس سلیقہ سے کیا گیا کہ ان کی ترتیب سننے والوں پر واضح ہو گئی۔ شفیع صاحب نے ایک جملہ ایسا کہا جس میں پرویز صاحب کی کاوشوں کا ماحصل بڑی حد تک سمٹ آیا ہے۔

"پرویز صاحب نے سیاسیات و عمرانیات، فلسفہ و نفسیات اور دوسرے جدید علوم کا مطالعہ اس جذبہ کے

سمانظر کیا کہ بیسویں صدی کے ذہن کو قرآن کے حقائق سمجھائے جائیں ۔"

تقریر کا خلاصہ

تعارف کے بعد پرویز صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ آج کے خطاب کا موضوع تھا۔ اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں ہے ۔ میں نے گزشتہ چند بیس سال میں پرویز صاحب اور بیشتر کے تقریباً تمام ممتاز مقرروں اور مشکروں کی تقریریں سنی ہیں ۔ لیکن یہ خطاب بصیرت و جذبہ کا ایسا امتزاج تھا جس نے ذہن کو بھی مطمئن کیا اور دل کی گہرائیوں کو بھی نور سے منور کر دیا ۔ اس خطاب کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

" اسلامی مملکت کے سربراہ کی ذمہ داریاں گوناگوں اور بے حد متنوع ہوتی ہیں ۔ لیکن ان مختلف ذمہ داریوں کی سمت ایک ہی ہوتی ہے ۔ اور وہ یہ کہ افراد معاشرہ کی زندگی کو انسانی سطح پر لایا جا سکے ۔ اس عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے اسلامی مملکت کے سربراہ کو اپنی ذات کو نمونہ بنانا پڑتا ہے ۔

ایچ۔ جے۔ میکن نے لکھا ہے کہ کائنات کی تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی اس انسان کی ہے جو تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ عقل مند اور مدنی الطبع ہے ۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ انسان کسی ایسے سیاسی نظام اور نظام حکومت کو جنم نہ دے سکا۔ جسے مثالی قرار دیا جا سکے ۔ خوش آیند نظریاتی خاکے ہمیشہ پیش کئے گئے مگر جب انہیں عملی طور پر نافذ کیا گیا تو حسرت و محرومی کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہوا۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس مغربی عالم اور سیاست داں کی نظر سے انسانی تاریخ کا صحیفہ یوں گزرا کہ اس کے چند اوراق گم تھے ۔ یا ممکن ہے کہ اس خلا کا سبب مغرب کا ذہنی تعصب ہو ۔ ورنہ وہ یہ نہ کہہ سکتا کہ انسانی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں گزرا جس میں انسانی احتیاجات کی تکمیل مکمل طور پر کی گئی ۔ آسمان کی نگاہوں سے ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جس کے نقوش آج بھی ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں ۔ محمدؐ رسول اللہ والذین معہ کا دور ۔ وہ دور جب شرف انسانیت نے آدم خاکی کو ثریا نشین بنا دیا تھا اور یہ دنیا جنت ارضی بن گئی تھی ۔

وہ مملکت چھٹی صدی عیسوی میں وجود میں آئی تھی جس نے انسانیت کے جوہر مضمر کو آشکار کر دیا ۔ ساڑھے دس لاکھ مربع میل کے رقبہ کی سلطنت ۔ اس مملکت کا سربراہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سے (سربراہ مملکت سے بھی) کہیں بڑی حیثیت رکھتا تھا ۔ اس کے اسوۂ حسنہ کو انسانیت کے مستقبل کا معیار بننا تھا ۔ وہ تکمیل بشریت بن کر آیا ۔ اس کی ذات اللہ اور انسان کی رفاقت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی ۔ لیکن اس وقت ہم اس ذات اقدس و اطہر کے حیات طیبہ کے صرف اسی پہلو کو اپنے سامنے رکھیں گے ۔ اس نے اسلامی سربراہ کی حیثیت سے کیا کچھ کیا اور معاشی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوا۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے آپ کا کوئی کپڑا کبھی تہ کر کے نہیں رکھا۔ اس کے معنی واضح ہیں۔ یعنی حضورؐ کے پاس کوئی دوسرا جوڑا ہی نہ تھا۔ اللہ اکبر! لاکھوں دلوں کا مالک، ساڑھے دس لاکھ مربع میل کی سلطنت کا سربراہ ___ اور ایک جوڑا کپڑا ___ بخاری میں ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے جن کپڑوں میں وفات پائی ان میں کتنے ہی پیوند لگے تھے۔

ان حقائق و روایات سے کسے مجالِ انکار ہے لیکن ان کی توجیہ ہمارے یہاں اکثر درست انداز سے نہیں کی جاتی ___ کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش تھی۔ حالانکہ اللہ تعالے نے نبی اکرمؐ کے بارے میں فرمایا ہے کہ ہم نے تجھے ضرورت مند پایا اور غنی کر دیا۔ (وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ)۔

کبھی کہا جاتا ہے حضورؐ نے دنیا کو تیاگ دیا تھا۔ یہ بھی درست نہیں، کیونکہ اسلام نے رہبانیت کو باطل قرار دیا ہے۔ رہبانیت کا مسلک تو عیسائیوں نے خود ایجاد کر لیا تھا۔ قرآن تو واضح الفاظ میں اعلان فرما رہا ہے

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲)

اُن سے کہہ دو کہ وہ کون ہے جو بندوں کے سامانِ زینت و اسبابِ آرائش و زیبائش کو حرام قرار دیتا ہے" ظاہر ہے کہ اسلام یہ مسلک نہیں سکھاتا۔ وہ تو کائنات کو تسخیر کرنے کا سبق دیتا ہے۔

برادرانِ عزیز! سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ توجیہات درست نہیں تو حضور نبی کریمؐ کے اس انداز زندگی کی حقیقی وجہ کیا تھی؟ ___ اس کی توجیہ اسی وقت صحیح طور پر کی جا سکتی ہے جب ہم اسلامی مملکت کی نوعیت اور اس کے سربراہ کی ذمہ داریوں کو سمجھ لیں۔

اسلامی مملکت اس زمین پر اللہ کی حکومت کا دوسرا نام ہے۔ مملکت اللہ کی ان ذمہ داریوں کو پورا کرتی ہے جو اس نے مخلوق کے سلسلے میں اپنے اوپر لے رکھی ہیں۔ لوگوں کے رزق، مکان اور دوسری احتیاجات کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے ارتقا کے اسباب و وسائل مہیا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے ___ جب اسلامی مملکت اللہ کے نام پر لوگوں سے اطاعت حاصل کرتی ہے تو اللہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا بھی اس کا فرض ہے۔ اللہ کی ذمہ داریوں میں سے یہ بھی ہے کہ

وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

زمین پر چلنے والا کوئی متنفس ایسا نہیں، جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ نے اپنے اوپر نہ لے رکھی ہو" خدا اپنی یہ معاشی ذمہ داریاں اسلامی مملکت کے ذریعہ پوری کرتا ہے ___ اس حقیقتِ کبریٰ کی وضاحت، قرآن کریم نے مختلف مواقع پر کی ہے۔ مثلاً سورۂ لیٰسین میں ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۳۶/۴۷)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وسائل (رزق) کو مخلوق کے لئے کھلا رکھو تو کفر اختیار کرنے والے، مومنوں سے کہتے ہیں کہ ہم ان کے لئے رزق مہیا کریں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود رزق بہم پہنچا سکتا تھا؟ یہ کتنی بڑی گمراہی ہے۔"

اسی لئے برادرانِ عزیز! اسلامی مملکت کا پہلا منشور یا یوں کہئے کہ اللہ کی اس ذمہ داری کو قبول کرنا ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

"تمہاری اور تمہاری اولاد کے رزق کی ذمہ داری ہم لیتے ہیں"۔ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ اس لئے اسلامی مملکت کے دائرے میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا محض ایک ابتدا ہے۔ اور انتہا ہے تمام عالمِ اسلامی کا اس دائرہ میں آجانا۔

عرب کی سرزمین وادیٔ غیر ذی زرع اور بے برگ و گیاہ تھی۔ پیداوار کم تھی۔ نوزائیدہ مملکت کے مسائل بہت زیادہ تھے۔ اسلامی مملکت کی حدود میں جو افراد آئے ان میں سے بیشتر اسبابِ زیست سے بڑی حد تک محروم تھے۔ لیکن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے رزق کی ذمہ داری کو قبول فرمایا۔ اسلامی مملکت میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اللہ کے آخری نبیؐ اور کامل ترین انسان محمد مجتبیٰؐ کو اپنی ان معاشی ذمہ داریوں کا جس قدر خیال تھا اس کا اندازہ مختلف احادیث و روایات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے امور کا نگران بنایا ہو۔ اگر وہ لوگوں کی احتیاجات سے بے پرواہی برتے گا تو اللہ اس کی احتیاجات سے بے نیاز ہو جائے گا۔ ترمذیؒ کی روایت ہے کہ جو امام ضرورت مندوں پر اپنے دروازے بند کر دیتا ہے۔ اللہ اس پر آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ "جس بستی میں کسی شخص نے یوں رات بسر کی کہ وہ بھوکا رہا اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔"

اپنے ان ارشادات کو حضورؐ نے عمل کے قالب میں ڈھال دیا۔ حضرت رسالتمآبؐ کے قول و عمل میں جو مطابقت تھی اس کی مثال دنیا کی پوری تاریخ میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ آپؐ نے اعلان فرمایا کہ اگر کوئی شخص قرض کی حالت میں وفات پا جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی اسلامی مملکت کرے گی۔ اور اسی فرض کی تکمیل کی خاطر حضورؐ نے انتہائی سادہ زندگی بسر کی۔ کیونکہ اسلامی مملکت کے وسائل محدود تھے اور ان وسائل سے ہر فردِ مملکت کو یکساں حصہ اور حق دیا جا رہا تھا۔

حضراتِ محترم! مدینہ کی اسلامی مملکت کے قیام سے پہلے مکی زندگی ہی میں اس نظام کے ابتدائی خط و خال نظر آتے ہیں۔ مسلمان کی ایک پہچان قرآن نے یہ بھی بتائی ہے کہ یہ لوگ خود تنگی میں رہتے ہیں۔ اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ اشعر کے قبیلے کا یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان

کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا تو سائلے کھانے کو ایک جگہ جمع کر کے برابر برابر تقسیم کر دیا جاتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں ـــــ اور اشتراک کا یہی جذبہ مکی زندگی میں مسلمانوں کی تنظیم کو قوی تر بناتا رہا۔"

عہد مسعود رسالت مآب صلعم کے بعد پرویز صاحب نے انتہائی زریں اور درخشاں واقعات کے سلسلے کے ساتھ بتایا کہ خلفائے راشدین نے اسلامی مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی معاشی ذمہ داریاں کس طرح پوری کیں ـــــ واقعات کا انتخاب۔ قوتِ بیان اور لہجہ میں سوز دروں کے شعلہ کی لپک نے بکھرے ہوئے واقعات کو منطق و استدلال کے دھاگے میں یوں پرو دیا کہ اسلامی مملکت کا معاشی و اقتصادی نظام دل و نگاہ کے سامنے اپنی تمام درخشانیوں کے ساتھ ابھر آیا۔

میرا کام تو پرویز صاحب کے دورۂ کراچی میں آپ کو اپنے ساتھ شریک کرنا ہے۔ اگر ایک ہی اجتماع کی روداد طویل ہوتی گئی تو شاید آپ کو طلوع اسلام کے کئی شماروں کا انتظار کرنا پڑے گا۔ مختصر یوں سمجھئے کہ پرویز صاحب نے دورِ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) والذین معہٗ کا ایسا متحرک اور جیتا جاگتا نقشہ پیش کیا کہ نگاہِ تصور کے سامنے کتنے ہی منظر حقیقت بن کر ابھرے ـــ چند لمحوں کے لئے یوں محسوس ہوا جیسے ہمارا وجود خاک مدینہ کے سنگ ریزوں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ سنگ ریزے جو ان قدسی نفسوں کے قدموں کو بوسے دے رہے ہیں ـــ مدینہ کی فضاؤں میں وہ صدیق اکبرؓ کی آواز گونجی ـــ "خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے میرا وظیفہ مدینہ کے ایک مزدور کی اجرت کے برابر ہو گا" اور وہ فاروقِ معظمؓ اعلان فرما رہے ہیں کہ "اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو خدا کی قسم اس کی ذمہ داری بھی عمرؓ پر ہو گی۔"

پرویز صاحب نے تقریر ختم کرتے ہوئے کہا کہ آج کے حالات میں قرآن کے اس معاشی اور سماجی نصب العین تک ایک رات میں نہیں پہنچا جا سکتا۔ لیکن اسلام کے عطا کردہ نقشہ کو اپنائے بغیر ہم سلامتی و سکون سے ہم کنار نہیں ہو سکتے۔ اگر حکمران یہ سمجھنے لگیں کہ حکمرانی ایک امانت ہے تو وہ دور ایک بار پھر تاریخ کے صفحات سے نکل کر عملی حقیقت بن جائے گا جس کو حضور نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں پیش فرمایا تھا اور ایک ایسی دنیا وجود میں آ جائے گی جہاں اسود و احمر کی کوئی تفریق نہ ہو۔ وہی دنیا، وہی نظام، کاروانِ انسانیت کی آخری منزل ہے گا۔

تقریر سے پہلے ہی شفیع صاحب نے اعلان کر دیا تھا کہ پرویز صاحب اس موضوع سے متعلق سوالات کے جوابات تقریر کے بعد دیں گے۔ تقریر ختم ہوتے ہی سامعین نے تحریری طور پر سوالات بھیجنے شروع کر دئے۔ سوالات کا یہ سلسلہ اس بات کی شہادت تھا کہ دلوں میں کتنی بے چینی ہے۔ کتنے لوگ ہیں جن کی آنکھیں اس صبح کے انتظار میں "روزنِ دیوارِ زنداں" ـــــ

بنی جا رہی ہیں۔ کتنے ذہن ہیں جو یہی سوچ رہے ہیں کہ ؎

کیا جانئے کب یہ پاپ کٹے، کیا جانئے کب وہ دن آئے
جس دن کے لئے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں ؟

آدھے گھنٹے کی مختصر مدت میں پرویز صاحب نے کم و بیش ۴۰ سوالوں کے جواب دئے — ان کے ذہن کی برق رفتاری پر مجھے تعجب ہو رہا تھا — ادھر سوال نگاہوں نے پڑھا اور ادھر مختصر مگر جامع جواب اپنے تمام الفاظ میں سامعین تک پہنچ گیا۔ یہ بات اسی شخص کے لئے ممکن ہے جس کے ذہن میں مسئلہ کا ہر پہلو واضح اور روشن ہو۔ سارے سوالات اور جوابات کا دہرانا سردست ممکن نہیں۔ چند سوالات اور ان کے جوابات مختصراً لکھتا ہوں۔ محض اس لئے کہ ان سوالات سے اپنی قوم کے طرز فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

سوال : اگر اسلامی مملکت کا فریضہ تمام افراد کی معاشی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے تو اسلام اور اشتراکیت میں فرق کیا ہے ؟

جواب : اسلامی مملکت کا یہی ایک فریضہ نہیں ہے۔ بلکہ فرائض میں سے ایک فرض ہے۔ قرآن انسانوں کو طبعی ضروریات سے اس لئے نجات دلاتا ہے کہ وہ حیوانی زندگی کی سطح سے بلند تر ہو کر اعلیٰ اقدار حیات کی تکمیل کر سکیں — جو اسلام کی ابتدا ہے۔ وہ اشتراکیت کی انتہا ہے — اشتراکیت کے نزدیک افراد کی انفرادیت اور ذات کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس میں افراد، مملکت کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہیں۔ اور بس۔ اسلامی مملکت کی انتہا اور مطمح نظر یہ ہے کہ مملکت کے ہر فرد کی ذات تکمیل تک پہنچتی چلی جائے۔ یہی بات اسلامی ریاست کے قیام کا ایک نہایت اہم جواز ہے۔

سوال : حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ترکہ نہیں چھوڑا کیا ہمارے لئے اس سنت کی اتباع ضروری نہیں ہے ؟

جواب : یقیناً ضروری ہے۔ ہماری نجات اسوۂ حسنہ نبویؐ کی پیروی ہی میں مضمر ہے۔ مگر اس کے لئے پہلے نظام اسلامی کا نفاذ لازمی ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ انفرادی نہیں ہے۔ اجتماعی ہے — اور یہ منزل تدریج اور آہستہ آہستہ آئے گی۔

سوال : اگر ترکہ نہ چھوڑنا اسوۂ حسنہ ہے تو قرآن میں ترکہ اور وراثت اور صدقہ خیرات کے احکام کیوں ہیں۔ ؟

جواب : وراثت اور صدقہ خیرات کے احکام عبوری دور کے لئے ہیں۔ جب اسلامی نظام مکمل ہو جائے گا تو صدقہ خیرات کا سوال بھی پیدا نہ ہو گا۔ اس وقت کوئی محتاج ہی نہیں ہو گا تو صدقہ خیرات دیا کسے جائے گا۔

۴ نومبر ۱۹۶۲ء

آج گل رعنا کلب میں عائلی قوانین کے موضوع پر پرویز صاحب نے عورتوں کے اجتماع سے خطاب فرمایا۔ اس

اجتماع میں شرکت کے لئے شرف انسانیت کی کڑی شرط لازم تھی۔ چنانچہ ایک بہن کے تاثرات پیش کرتا ہوں اور اس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔

"پرویز صاحب کی تقریر سننے کے لئے زیادہ تر وہ عورتیں آئی تھیں جو جلسوں اور جلسوں میں فیشن کے طور پر نہیں آتیں یہ اجتماع مظلوم اور ستائی ہوئی صنف کی نمائندگی کر رہا تھا ـــــ یہ وہ عورتیں تھیں جو اپنی مظلومیت کی وجہ سے دین سے برگشتہ ہو جاتیں۔ اگر قرآن کریم کی حقیقی تعلیمات عورت کے بارے میں ان تک نہ پہنچتیں۔

پرویز صاحب عام طور پر ذرا مشکل اردو بولتے بھی ہیں اور لکھتے بھی ہیں ـــــ مگر اس جلسہ میں تو وہ ایسی رواں، ملیس زبان بول رہے تھے اور ایسی نرمی کے ساتھ جیسے باتیں کر رہے ہوں۔ انہوں نے نکاح۔ طلاق۔ تعدد ازدواج، یتیم پوتے کی وراثت جیسے اہم موضوعات کے بارے میں قرآن کریم کے احکامات بتائے جن کو سنکر یہ پتہ چلا کہ موجودہ عائلی قوانین نے ہمیں اس سے بہت کم دیا ہے۔ جو قرآن ہم اسو سال پہلے دے چکا ہے اور اس پر بھی اتنا شور مچایا گیا ہے۔

اجتماع کے بعد مجھے پرویز صاحب کا کتابچہ "عائلی قوانین" قرآن کریم کی روشنی میں پڑھنے کا موقع ملا۔ اپنی تقریر میں انہوں نے بعض مسائل کے بارے میں دلائل پیش کئے۔ بعض لوگوں نے پچھلے دنوں سے تعدد ازدواج کے حق میں یہ بات بھی شروع کی ہے کہ تعدد ازدواج ایک حیاتیاتی حقیقت ہے۔ ایک مرد متعدد عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کر کے انہیں حاملہ بنا سکتا ہے لیکن ایک عورت بہت سے مردوں سے اختلاط کے باوجود ایک ہی بچہ پیدا کر سکتی ہے۔ اس دلیل کے سلسلہ میں پرویز صاحب نے کہا کہ یہ حضرات نکاح کا مقصد ہی نسل کشی سمجھتے ہیں اور انسانی زندگی کو حیوانی سطح پر لانا چاہتے ہیں۔ حیوانات کی زندگی میں جنسی تعلقات کا صرف یہی پہلو ہے یعنی بچے پیدا کرنا۔ اسلام نے نکاح کا مقصد محبت و مودت پیدا کرنا بتایا ہے۔ نکاح کے ذریعہ ہی انسانی معاشرہ کی پہلی اکائی یعنی خاندان وجود میں آتا ہے۔ اور اسی اکائی کے ذریعہ بچوں کی اچھی تربیت ہوتی ہے۔ وہ بہتر انسان بنتے ہیں اور معاشرہ ارتقار کی منزلیں طے کرتا ہے۔

تعدد ازدواج کے حق میں دوسری دلیل ایک بڑے مشہور اور مقبول عوام مذہبی رہنما نے کراچی کے ایک بڑے جلسے میں یہ پیش کی تھی کہ صاحب یہ کیسا ستم ہے کہ دو سرا نکاح کرنا تو جرم ہے لیکن زنا کاری کی کوئی سزا نہیں ہے۔ پرویز صاحب نے کہا ان دونوں باتوں میں تعلق کیا ہے۔ یہ حضرات غیر متعلق باتوں کو جمع کر کے ان سے من مانے نتائج اخذ کرتے ہیں ـــــ پتہ نہیں اس دلیل سے تعدد ازدواج کا جواز کیسے حاصل ہوتا ہے۔ زنا اسلام کی نگاہ میں بہت بڑا جرم ہے عصمت کی حفاظت قرآن کی رو سے حیات انسانی کی مستقل قدر ہے۔ قرآن نے خود زنا کی سزا مقرر کی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ تعدد ازدواج کے خلاف شور مچانے والوں میں سے کسی نے زنا کے خلاف قانون بنانے کا مطالبہ کیوں نہیں کیا؟ ـــــ اور اس ضمن میں نیشنل اسمبلی میں کوئی بل کیوں نہیں پیش کیا۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ تعدد ازدواج پر قیود و حدود لگانے کے خلاف غوغا آرائی"

۱۵۔ اور ۱۶ ؍ نومبر

شاید میں آپ کو پہلے یہ بات بتا چکا ہوں کہ اس بار جلسوں کے ساتھ ساتھ انفرادی رابطہ اور ملاقات کی محفلوں کو پرویز صاحب کے پروگرام میں، بزم طلوع اسلام، کراچی نے شامل کیا ۔ بہت سے احباب نے اس خیال کی مخالفت کی تھی ۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ پرویز صاحب کے دوران قیام، عوام کو زیادہ سے زیادہ تقریریں سننے کا موقع ملنا چاہئیے لیکن ذاتی رابطہ کی محفلوں کا خیال اس لئے ہوا تھا کہ زیادہ تعلیم یافتہ احباب بعض اہم اور مشکل مسئلوں پر پرویز صاحب سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتے تھے۔ بعض مسائل بنیادی طور پر قانونی ۔ فلسفیانہ ۔ اور تکنیکی ہیں ۔ اور ایسے مذاکروں سے عام آدمی کو شاید کچھ بھی حاصل نہ ہو سکے ۔ اس بار ذاتی رابطہ اور ملاقات کی مجلسیں اس درجہ کامیاب ثابت ہوئی ہیں کہ اب اس تجربہ کی افادیت اس کی متقاضی ہے کہ ان محفلوں کو "تجربہ" نہ کہا جائے ۔

۱۵ ؍ نومبر کو پرویز صاحب، جناب خالد اسحاق صاحب کے عشائیہ میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے ۔ خالد اسحاق صاحب ممتاز قانون دان اور اسسٹنٹ اٹارنی جنرل ہیں ۔ اس عشائیہ میں وکیل اور قانون دان حضرات نے شرکت کی ۔ اور "اسلام میں قانون سازی" کے موضوع پر گفتگو ہوتی رہی ۔ موضوع کے ہر گوشے کا جائزہ لیا گیا ۔ جب گفتگو ختم ہوئی اور "شب بخیر ۔ السلام علیکم" کہنے کا وقت آیا تو بیشتر حضرات اس باب میں پرویز صاحب سے متفق ہو چکے تھے کہ امت کے ہر طبقۂ خیال اور تمام افراد کے درمیان صرف ایک چیز ہی مشترک ہے اور یہ "قدرِ مشترک" قرآن کریم ہے ۔ اسی لئے یہ کتاب مقدس ہی قانون سازی کی بنیاد بن سکتی ہے ۔ قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کو اساسی حیثیت دینے سے اختلافات کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو گا ۔

۱۶ ؍ نومبر کو اسد مجید صاحب کے عصرانہ میں نوجوان طلبا بھی تھے ۔ علم و فن کے مدعی وہ حضرات بھی جو سننے کی جگہ بولنے کے جذبہ سے آئے تھے ۔ وہ خواتین بھی تھیں جن کے ذہن "سزا و جزا" ۔ "جنت و دوزخ" ۔ "ایصالِ ثواب" جیسے مسائل سے پراگندگی محسوس کرتے ہیں اور جنہیں ذہنی کشمکش سے نجات نہیں ملتی ۔ کوئی تین گھنٹوں کی گفتگو کے بعد جب پرویز صاحب نے مسکراتے ہوئے حاضرین کو الوداعی سلام کیا تو نوجوان طالب علموں اور خواتین کے چہروں پر ہم نے وہ کیفیت دیکھی جو ذہنی سکون کی علامت ہو۔

۱۸۔ نومبر

۱۸ ؍ نومبر کو صبح ساڑھے نو بجے ادلڈ اسمبلی ہال بندر روڈ میں پرویز صاحب کا درس قرآن شروع ہوا ۔ وقت سے بہت پہلے ہال کی ہر نشست پُر ہو چکی تھی ۔ باہر برآمدے کی کرسیاں بھی سننے والوں سے بھری ہوئی تھیں اور لوگ دور تک دیواروں پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ یہ باہر بیٹھنے والے مقرر کو بھی دیکھ نہ سکتے تھے ۔ لیکن قرآن کی آواز تو ان تک پہنچ رہی تھی ۔ یہ لوگ قرآن کی آواز سننے آتے تھے مقرر کو دیکھنے تو نہیں آئے تھے ۔ ویسے نفسیاتی طور پر مقرر کو دیکھے بغیر ایک بے چینی سی ضرور محسوس ہوتی ہے ۔ مگر

اس صبح قرآن کی آواز نسیم صبح گاہی کی طرح دلوں کو سکون عطا کر رہی تھی۔ کہیں بے چینی کی لہر نہ تھی۔ پرویز کی زبانی قرآنی فکر کا شعلہ فضا میں نور پاشی کر رہا تھا۔۔۔ اس لمحے نہ جانے میرے ذہن کی وادیوں میں یہ شعر کہاں سے آ ہوئے تاتار کی طرح بغتتہً آ گیا ہے

ایسا چمکا تری تقریر کا شعلہ جیسے آسماں پر شبِ تاریک میں تنہا تارا

آج کی زندگی شبِ تاریک ہی تو ہے۔ لیکن رب العالمین کا بڑا شکر ہے کہ قرآن ہند جزدانوں سے نکل کر عہد حاضر کے آسمانوں پر امید کا تنہا تارا تو بن گیا ہے۔۔۔ وہ تارا جو آدمِ خاکی کو نئے عروج کی طرف بلا رہا ہے اور اب وہ دن بہت دور نہیں ہے جب آدمِ خاکی کا یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل بن جائے گا۔

پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا موضوع تھا۔

"ظالم کبھی پنپ نہیں سکتا"

یہ مسئلہ آج کے اہم ترین انسانی مسائل میں سے ایک ہے۔ انسان نے تسخیرِ کائنات کے کتنے مراحل طے کر لئے ہیں لیکن

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہریاری ہے قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

کتنے ہی ملکوں میں ابھی تک ملوکیت باقی ہے اور جہاں ملوکیت نہیں وہاں بھی ہوسِ زمین گیری نے جمہوریت کو ایک نئے سامراج کا روپ دے دیا ہے۔ ہنگری، کیوبا، کشمیر، حیدرآباد، جوناگڑھ، گوا ۔۔۔ یہ سارے انسانیت کے جسم پر کوڑھ کے نشان ہیں۔۔۔ ظلم کی ان مثالوں سے قطع نظر قرآن نے تو ظلم کے کسی گوشے کو تاریکیوں میں اوجھل نہیں ہونے دیا۔ پرویز صاحب نے قرآن کی روشنی میں ظلم کے تصور کو یوں اجاگر کیا کہ ہر سننے والا ایک نئی بصیرت کے ساتھ اس دن سالِ محفل سے رخصت ہوا۔ کاش ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو ظلم کے خلاف اللہ کا سپاہی جانے اور اپنے اپنے دائرۂ اقتدار میں ظلم کی طاقتوں سے نبرد آزمائی کو مسلکِ حیات بنا لے۔ پرویز صاحب کے درس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔[1]

۱۹ر نومبر

۱۹ر نومبر کی شام کو یونی ورسٹی کیمپس کے اسٹاف ٹاؤن میں پرویز صاحب نے ایک عصرانہ اور محفلِ ملاقات میں شرکت کی۔ اس عصرانہ کو طاہرہ کشفی (ام عاکف) نے مرتب کیا۔۔۔ طاہرہ کشفی، جو پرویز صاحب کی طاہرہ بیٹی ہیں۔ اب یہ نام ایک استعارہ بن گیا ہے۔

اس محفل میں یونی ورسٹی کے کئی اساتذہ نے شرکت فرمائی۔ ان میں سے بعض کے لئے پرویز صاحب کا نام

---

[1] یہ خلاصہ مستقل مقالہ کی شکل میں اس اشاعت میں، الگ شائع ہو رہا ہے۔ (طلوع اسلام)

نیا نہیں تھا۔ وہ طلوعِ اسلام کا لٹریچر پڑھتے رہے تھے۔ لیکن سائنس کے کچھ اساتذہ پرویز صاحب سے چنداں آشنا نہ تھے۔ پرویز صاحب سے ان کی ملاقات اور گفتگو میں کوئی تعصب ذہنی "موجود نہ تھا۔ ان میں سے کسی نے پہلے سے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اور ویسے بھی نہ جانے مجھے ہمیشہ سے اس بات پر یقین کیوں ہے کہ قرآن کے بہت سے مطالب مفاہیم کو سائنس والے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ قرآن کوئی سائنس کی کتاب ہے بلکہ اس لئے کہ سائنسی نقطۂ نظر میں ذاتی جذبات کی کم گنجائش ہوتی ہے۔

اس شام بحث کی سطح بہت بلند تھی۔ بیگم فرحت اقبال نے خصوصیت کے ساتھ بحث میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لیا۔ ان کے سوالات اس حقیقت کے غماز تھے کہ یہ خاتون ان سوالات پر غور کرتی رہی ہے۔ ایسے سوالات جن سے نوعِ انسانی کا مستقبل وابستہ ہے۔

دو ڈھائی گھنٹے جیسے لمحوں میں بدل گئے اور آٹھ بجے جب یہ محفل ختم ہوئی تو "آسودگی" اور "تشنگی" —— یہ دونوں کیفیات ہر شخص کو محسوس ہو رہی تھیں۔ تقریباً سب ہی یوں سوچ رہے تھے کہ کاش ہم اڑتے ہوئے وقت سے کچھ اور ساعتیں مانگ سکتے۔

اس محفل کا کیف یقیناً پرویز صاحب کو بھی عرصہ تک یاد آتا رہے گا۔ اس محفل کے بیٹھنے والے وہ تھے جن کے ذہن ان کی گفتگو کے ساتھ پرواز کر سکتے تھے۔ بیگم ڈاکٹر محمود نے مجھ سے کہا کہ —— "آج کم از کم دین کے بارے میں ہمارے ذہن کے بند دریچے کھل گئے۔ بہت سے مسائل صاف ہو گئے ہیں۔ اور بہت سے مسائل پر سوچنے کی ہمت حاصل ہو گئی ہے۔ کوئی شخص ہم میں سوچنے کا جذبہ پیدا کر دے۔ یہی کیا کم ہے؟"

۲۰ / نومبر

۲۰ نومبر کو کنگ ہال میں بنیادی حقوق اور ان کے تحفظ کے بارے میں پرویز صاحب نے ایک بڑے اجتماع کو خطاب کیا آج بھی روشنی اور تقویٰ کا سیلِ نور ملک معید کے ذوقِ جمال کو داد دے رہا تھا۔

۸ بجے جلسہ کا آغاز مولانا عبدالرب کی صدارت میں ہوا۔ حافظ برکت اللہ صاحب نے قرآن حکیم کی آیاتِ مقدسہ کی تلاوت فرمائی۔ حافظ صاحب موضوع کے اعتبار سے آیات کا انتخاب بہت سلیقہ سے کرتے ہیں۔

پرویز صاحب نے آج کے نہایت اہم موضوع پر تقریر شروع کی۔ اس موضوع کی اہمیت ہمارے لئے اس لئے اور بڑھ گئی ہے کہ آج ملتِ پاکستان اپنے نئے دستور کے ذریعہ بنیادی حقوق کا تحفظ چاہتی ہے۔ اور اب تو حکومت نے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لئے دستور میں ترمیمی بل بھی پیش کر دیا ہے۔ تقریر کا خلاصہ ملاحظہ ہو۔

"پہلا سوال یہ ہے کہ بنیادی حقوق انسانیت ہیں کیا؟ انسانی فکر نے اس بارے میں کیا سوچا ہے اور وحی الٰہی نے

کس طرح ہماری رہنمائی کی ہے ؟

انسان نے اپنی زندگی اور اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے اپنی طبع مدنی کے تحت حکومت کو جنم دیا ۔ لیکن حکمران طبقوں نے آزادی کو سلب کرنا شروع کر دیا ۔ اور اپنے حقوق کو مستحکم کرنے کے لئے DIVINE RIGHT کے نظریہ کو جنم دیا گیا ۔ حکمران "ایشور کا سایہ" اور "ظل اللہ" قرار دیا گیا ۔ بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں پہنچ گئی ۔ حکمرانی کے لئے سندیں وضع کی گئیں اور انہیں خدا کی طرف منسوب کیا جاتا رہا ۔ انسانی فکر یوں ہی آگے بڑھ رہی تھی کہ سترہویں صدی میں کچھ ایسے مفکر پیدا ہوئے جنہیں یہ خیال ہوا کہ انسان کو کچھ بنیادی حقوق ملنے چاہئیں ۔ "زندگی" "صحت" "آزادی" اور املاک کو جان لاک نے بنیادی حقوق قرار دیا ۔ ٹام پین نے انہی بنیادی حقوق کو اپنی تصنیف "حقوقِ آدم" میں زیادہ وضاحت سے پیش کیا ۔ انہیں تصورات کو فرانس کی نیشنل اسمبلی نے اپنایا ۔ روس نے ان حقوق میں ایک اور حق کا اضافہ کیا اور وہ یہ کہ کسی کی محنت کے پھل کو کوئی غصب نہ کرے گا ۔ آخر ان حقوق کو ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ نے اپنے منشور میں شامل کر لیا ۔ جس میں کم و بیش تیس بنیادی حقوق کا ذکر ہے ۔ یہ انسانی کوششوں کی آخری کڑی ہے جسے فکرِ انسانی کا شہکار اور حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے ۔

اس منشور کو حرفِ آخر سمجھنے والے یہ بھول جاتے ہیں (یا دانستہ بھلا دینا چاہتے ہیں) کہ جب ان تصورات سے دنیا ناآشنا تھی، اس وقت محمد رسول اللہ صلعم کے وسیلہ سے ایک ایسا چارٹر نازل ہوا جو انسانیت کو اقوامِ متحدہ کے چارٹر سے بہت آگے لے جاتا ہے ۔ اور اس منشور کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً نافذ کر دیا ۔ یہ تھا انسان کے بنیادی حقوق کا پہلا اعلان نامہ ۔ اس کے چند پہلو میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ۔ آپ اقوامِ متحدہ کے منشور سے اس کا مقابلہ کیجئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وحیٔ الٰہی انسانی فکر سے کس قدر آگے ہے ۔

۱ ۔ پہلا حق جو قرآن نے عطا کیا ہے ۔ یہ ہے کہ "لقد کرمنا بنی آدم" ان چند لفظوں کو پھیلایئے تو انسانی حقوق کی ایک دنیا ان میں آپ کو نظر آئے گی ۔ قرآن کے اس حق کی رو سے کوئی ایسا قانون جو پیدائش کی بنا پر انسانوں میں تفریق کرے یکسر اسلام کے خلاف ہے ۔

۲ ۔ خلقکم من نفس واحدۃ ۔ تمام انسان نفسِ واحدہ سے پیدا کئے گئے ہیں ۔ وحدتِ خالق ، وحدتِ انسان کی دلیل ہے ۔ زبان ، نسل ، رنگ ، جغرافیہ کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی ۔ کوئی انسان ، دوسرے انسان کو اپنا محکوم نہیں بنا سکتا ۔ اسلامی نظام میں کسی فرد یا طبقہ کو حکمرانی کا حق حاصل نہ ہوگا بلکہ

وامرھم شوریٰ بینھم

یہ ایمان والے "حدود اللہ" کے اندر رہتے ہوئے باہمی مشاورت سے اپنے مسائل طے کریں گے۔

۳۔ پیدائش کی بنا پر انسان تقسیم نہیں کئے جائیں گے۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین کردار، اخلاق، اور صلاحیتوں کی بنا پر کیا جائے گا۔ ہر فرد کے عمل کا معاوضہ اسے پورا پورا دیا جائے گا۔ اور لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ جو شخص جس کام کے لئے محنت نہ کرے گا اس پاس کا کوئی حق نہ ہوگا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا آج کے نظام میں کتنے افراد دوسروں کے فرائض کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں۔

۴۔ عدل ایک بنیادی انسانی حق ہے۔ اس حق کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اسے انسان کس طرح مسخ کر رہا ہے۔ آج کے کتنے ہی قوانین ظالمانہ ہیں۔ پھر ان قوانین کی بنیاد پر فیصلے عدل کی مثال کیسے بن سکتے ہیں۔ عدل کے سلسلہ میں قرآن نے حکم دیا ہے کہ "دشمن کے ساتھ بھی عدل کرو" "دشمن عدل" کو بنیادی حق کے طور پر طلب کر سکتا ہے۔

۵۔ عدل سے آگے بڑھئے تو ایک اور بنیادی حق کا ذکر ملتا ہے۔ عدل کے ساتھ احسان ـــ جو کسی منشور میں نہیں ملتا۔ قرآن کی رو سے احسان کے معنی ہیں "کسی کی کمی کو پورا کر دینا" کسی مزدور سے آپ تین روپے مزدوری طے کر کے ادا کر دیں تو عدل کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ لیکن اگر آپ جانتے ہیں کہ تین روپوں میں اس کے بال بچوں کا پیٹ نہیں بھر سکتا تو آپ کا فرض یہ ہے کہ اسے اس کی ضرورت کے مطابق دیں۔ یہ احسان ہے، جسے وہ اپنے حق کے طور پر معاشرہ سے طلب کر سکتا ہے۔

یہ حقوق افراد کو اپنے کردار اور صلاحیتوں کے مطابق ملتے ہیں۔ لیکن قرآن نے وہ حقوق بھی عطا کئے ہیں جنہیں ہر فرد اسلامی مملکت سے طلب کر سکتا ہے۔ یہ حق انسان کی بنیادی ضروریات سے تعلق رکھتے ہیں۔ خدا کے نام پر قائم ہونے والے نظام سے ہر فرد کھانا۔ کپڑا۔ مکان۔ تعلیم اور علاج کا مطالبہ اپنے حق کے طور پر کر سکتا ہے۔ ہر وہ چیز جس سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

ان حقوق کی وجہ سے معاشرہ میں نہ خوف ہوتا ہے اور نہ حزن۔ نہ تو کوئی بیرونی خوف و خطرہ ـــ نہ ذہنی اندیشہ۔ خیال کی آزادی، رائے کی آزادی، مذہب کی آزادی ..... یہ سب چیزیں تو اس معاشرے میں انسان کو ضمناً مل جاتی ہیں۔ جنہیں عہد حاضر نے اتنی اہمیت دے رکھی ہے۔ خدا نے انسان کو اختیار اور ارادہ کی ایسی آزادی عطا کی ہے کہ وہ جس راستے پر چاہے چل سکتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین۔ اسی لئے

۶۔ مکمل آزادی، انسان کا نہایت اہم بنیادی حق ہے۔

۷۔ قرآن نے صرف فکر و اظہار کی آزادی ہی عطا نہیں کی ہے بلکہ حق کہلانے کا مطالبہ، مملکت اسلامی ہر فرد سے کر سکتی ہے۔ آج تو ہم عواقب و نتائج کے اندیشہ سے حق بات کہتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں۔... اور یہاں

اسلام کے نظام میں حق کہلانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے ۔ اس نظام میں کوئی مدعی اور مدعا علیہ کی طرف سے گواہ ہو کر نہیں جاتا۔ بلکہ اللہ کی طرف سے گواہ ہو کر جاتا ہے ..... خواہ یہ گواہی اس کی اپنی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔

۸۔ جان کی حفاظت انسان بطور حق کے لے سکتا ہے۔ انسانی جان کی قیمت یہ ہے کہ جرم قتل کی سزا یا بغاوت کے جرم کے بغیر اگر کسی نے ایک انسان کو قتل کر دیا تو گویا اس نے انسانیت کو قتل کر دیا۔

۹۔ سکونت اور مکان کے تحفظ کا حق بنیادی حق ہے۔

۱۰۔ عصمت کی حفاظت بطور حق کے طلب کی جا سکتی ہے۔ قرآن نے عصمت کے تحفظ کو حق قرار دیا ہے۔ اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ۔ آج ہمارے معاشرہ میں عورت اور مرد کے لئے عصمت کے معیار ہی مختلف قرار دئے جا چکے ہیں۔ جس معاشرہ میں مرد اور عورت کے درمیان عصمت کے تصور میں یہ تفاوت پیدا ہو جائے کیا اسے اسلامی معاشرہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔؟

قرآن نے تو کسی شریف عورت کے بارے میں تہمت طرازی کو اتنا شدید جرم قرار دیا ہے کہ اس کے لئے اسی دُرّوں کی سزا مقرر کی گئی ہے۔

قرآن نے بنیادی حقوق عطا کئے ہیں مگر اس کے ساتھ کوئی تحدید (REGIMENTATION) نہیں ہے ۔ جیل خانہ سے بہتر تحفظ اور بنیادی ضروریات کی تکمیل اور کہاں ہو سکتی ہے ۔ مگر اسے بدترین زندگی سمجھا جاتا ہے، تحدید کی وجہ سے ۔ یہی فرق اسلام اور اشتراکیت کے درمیان ہے ۔ اسلام فرد کی ذات اور انفرادیت کا احترام کرتا ہے۔ اشتراکیت روٹی دیتی ہے ۔ اور روح چھین لیتی ہے۔ اسلام روٹی بھی دیتا ہے اور جان بھی

ایں خدا نانے دہد جانے برد   آں خدا نانے دہد، جانے دہد

ذوق اور اسباب زینت (جمالیاتی حس کی تکمیل کے جائز وسائل) کا حصول بھی انسان کا بنیادی حق ہے، جسے کوئی انسان سے چھین نہیں سکتا ۔ شرط صرف یہ ہے کہ "حدود اللہ" کو توڑا نہ جائے۔

میں نے اسلام کے منشور حقوق کی چند شقیں آپ کے سامنے پیش کیں ۔ دیکھئے کہ یہ منشور انسانیت کو کس بلند منزل کی طرف لے جاتا ہے ۔ اقوام متحدہ کے منشور کے حقوق مشروط ہیں۔ اور اسلام کے حقوق غیر مشروط ۔ سوائے اس کے کہ اللہ کی حدیں برقرار رہیں ۔ اقوام متحدہ کے حقوق میں ترمیم و تغیر ہو سکتا ہے ۔ لیکن اسلام کا منشور مکمل ہو گیا ہے۔ اور اسے قرآن کے آغوش میں یہ کہہ کر محفوظ کیا گیا ہے کہ ان میں کسی کو ترمیم و تغیر کا کوئی حق نہیں ہے۔

اقوام متحدہ کے منشور پر اس وقت تک عمل نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کوئی قوت نافذہ "نہ ہو ۔ اور خدا نے ہمیں اپنا منشور عطا کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم ایک بین الاقوامی قوم ہو۔ ایسی قوم جو دنیا کی ہر قوم سے یکساں فاصلے پر ہو

اور تمہارا فرض ہے کہ یہ دیکھو کہ دنیا کی کوئی قوم اس منشور کی دفعات کو پامال تو نہیں کر رہی ہے —— آج تو عہدِ حاضر کے ذہن کو بھی اس کا اعتراف ہو چلا ہے کہ بغیر کسی آئیڈیالوجی کے ان حقوق پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے چودہ سال پہلے ایمان یا اسی آئیڈیالوجی کو حقوقِ انسانی کے تحفظ کی بنیاد قرار دیا تھا۔"

تقریر کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا —— سارے سوالات موضوع سے متعلق تھے۔ بعض اہم سوالات دین کے بارے میں ہمارے عام آدمی کے حقیق اور صحیح شعور کی غمازی کر رہے تھے۔ مثلاً یتیم پوتے کی وراثت کو بنیادی حقوق سے وابستہ سمجھنا۔ شعور کی دلالت ہے۔ غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں پرویز صاحب نے قرآن کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسلام نے غلامی کے دروازوں پر ہمیشہ کے لئے تالے ڈال دیئے ہیں۔ غلامی کا سب سے بڑا دروازہ اور سرچشمہ جنگ تھا۔ قرآن نے جنگی قیدیوں کے بارے میں صاف صاف حکم دے دیا ہے کہ انہیں یا تو فدیہ لے کر چھوڑ دو یا احسان رکھ کر۔

سوالات کے دوران پرویز صاحب کے اجتماعات میں لوگوں کی توجہ، دلچسپی اور انہماک غیر معمولی بات ہے یہ کیفیت اور نظم و ضبط کسی اور اجتماع میں آپ کو شاید کہیں اور نظر آئے۔

۲۲ر نومبر

۲۲ر نومبر کو ہوٹل میٹروپول میں آخری اجتماع کا اہتمام کیا گیا۔ میٹروپول کا وسیع لان سننے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ بزمِ طلوعِ اسلام نے اس اجتماع کے لئے دعوت نامے جاری کئے تھے۔ دعوت نامے نشستوں کے مطابق تھے۔ اور انتہائی غم کے ساتھ مجبوراً سینکڑوں افراد سے معذرت کرنی پڑی۔ دعوت نامے ممتاز شہریوں کو ڈاک کے ذریعے بھیجے گئے تھے۔ لیکن حاضرین کی بڑی تعداد دعوت نامے حاصل کرنے کے لئے بزم کے دفتر آئی تھی —— یہ لوگ کیسے کیسے فاصلے طے کر کے آئے تھے۔ لانڈھی۔ ملیر، سعود آباد جیسی نواحی بستیوں سے لے کر حیدر آباد تک سے یہ لوگ آئے —— ہر آنے والا ہمیں یہ یقین دلاتا کہ کتنے ہی سینوں میں قرآنی تعلیمات کی قندیل روشن ہو چکی ہے۔

آج کے خطاب کا موضوع بھی بے حد اہم تھا۔

— "انسان اور جنگ"

کیوبا ہو یا کشمیر یا ہند چینی سرحدی جھگڑے ...... یہ سارے واقعات ہمیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ نوعِ انسانی ۔ کوہِ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے —— آج کا ذہن جنگ کے خطرے سے الجھ کر تعمیری کوششوں سے بھاگنے کا جواز ڈھونڈ رہا ہے۔

جابجا یہ جلسہ محمد شفیع صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ شفیع صاحب نے ان الفاظ میں حاضرین سے

پرویز صاحب کا تعارف کرایا۔

پرویز صاحب کا تعارف

بچپن میں مروجہ مذہبی تعلیم حاصل کی۔ پھر انگریزی پڑھی اور بی۔اے کیا۔ قرآن مجید سے دلچسپی شروع ہی سے تھی۔ کوئی تین سالہ ملازمت میں یہ دلچسپی علامہ اقبالؒ کے زیر ہدایت دن بدن بڑھتی گئی۔ مغربی مصنفین کو پڑھا۔ فلسفہ سائنس۔ تاریخ۔ سائیکالوجی وغیرہ علوم کو اس غرض سے اپنایا کہ بیسویں صدی کے ذہن کو قرآن مجید سمجھایا جائے۔

چنانچہ گہرے مطالعہ کے بعد قرآن کریم پر مضمون وار "معارف القرآن" کے نام سے کتابیں لکھنی شروع کیں۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب (من ویزداں) میں خدا اور انسان کے باہمی تعلق "رفاقت" کو بتاتے ہوئے لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو رفیقِ اعلیٰ کہا۔ یعنی انسان اللہ کا رفیقِ ادنیٰ ہے۔ دوسری کتاب (ابلیس و آدم) میں انسان کی پیدائش۔ وحی۔ ابلیس۔ شیطان۔ تقدیر۔ دعا۔ وغیرہ مشکل مضامین پر بحث کی۔ تین کتابوں (جوئے نور۔ برق طور۔ شعلۂ مستور) میں رسولوں اور ان کی قوموں کے حالات یکجا لکھے۔ کوئی ایک ہزار بڑے صفحوں کی کتاب (معراج انسانیت) میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بتیسر قرآن مجید سے مرتب کی۔ دو ہزار سال میں عقل نے انسانی معاملات میں جو رہنمائی کی اور جتنی ٹھوکریں کھائیں ان کو ایک کتاب (انسان نے کیا سوچا؟) میں واضح کیا۔ ایک کتاب (نظام ربوبیت) اس پروگرام کی تفصیل میں لکھی۔ جو قرآن مجید نے انسانوں کے مل جل کر رہنے کے لئے تجویز کیا ہے۔ اور جس میں کوئی شخص دھوکہ نہیں دے سکتا ہے نہ ننگا۔ نہ بھوکا رہ سکتا ہے نہ لاچار۔ کئی اور کتابیں (سلیم کے نام۔ طاہرہ کے نام۔ اسبابِ زوالِ امت۔ اسلامی معاشرت وغیرہ) اس لئے لکھیں کہ آنے والی نسل کے نوجوان مرد اور عورتیں قرآن مجید کے بنیادی اصولوں کو سمجھیں اور زندگی میں اپنائیں۔

قرآن مجید کے سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے عربی کی مستند کتابوں کی مدد سے چار جلدوں کی کتاب "لغات القرآن" لکھی۔ جس میں ہر لفظ کا مطلب اس انداز سے بیان کیا ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ پھر اس لغت کی بنیاد پر سارے قرآن کا مفہوم بھی اسی انداز سے لکھا کہ ہر آیت کا مطلب پڑھنے والوں کی سمجھ میں آسانی سے آ جائے۔

کتابوں کے علاوہ ماہنامہ "طلوعِ اسلام" میں قرآن مجید کی تعلیمات پر گزشتہ بیس پچیس سال سے بہت سے مضامین برابر لکھتے رہے ہیں۔ ان میں وہ مضامین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جن میں واردھا کی تعلیمی اسکیم کی مخالفت اور تحریک پاکستان کی حمایت بالخصوص قوم پرست علماء کے مقابلے میں شد و مد سے کی گئی تھی۔

معارف القرآن ۔ لغات القرآن ۔ مفہوم القرآن کا لکھنا اتنا بڑا اور اہم کام ہے جو قابل اشخاص مل کر ہی کر سکتے ہیں ۔ لیکن پرویز صاحب نے یہ مشکل ترین کام کسی اور کی کسی قسم کی مدد کے بغیر تن تنہا کر ڈالا ۔

قرآنی تعلیمات کے پھیلانے کے خلاف ایک گروہ ہمیشہ سے رہا ہے ۔ مالداروں اور زمینداروں کا ۔ گدی اور مصلیٰ نشینوں کا ۔ اور ان سب کا جو دوسروں کی کمائی پر جیتے اور مزے کرتے ہیں ۔ یہ گروہ آج بھی موجود ہے وہ کتابوں پر کچھ کہنے کی بجائے مصنف کو بدنام کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے ۔ اس نے فضا کو اس شور سے بھر دیا ہے کہ پرویز " منکرِ حدیث " لہٰذا " منکرِ رسالت " ہے ۔ یہ تہمت اور بہت بڑی تہمت ہے ۔ کیونکہ پرویز صاحب حدیثوں کا انکار نہیں کرتے ۔ وہ کہتے صرف یہ ہیں کہ حدیث کی کتابوں میں جو باتیں قرآن مجید کے صریحاً خلاف ہیں یا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر دھبہ لگتا ہے انہیں صحیح نہ سمجھا جائے ۔ یہی وہ حدیثیں ہیں جو دشمنانِ اسلام کو خلاف اسلام کتابیں لکھنے کی جرأت دلاتی ہیں ۔

تہمت تراشی کا سب سے اہم پیمانہ یہ ہے کہ پاکستان جو اسلامی روایات کو زندہ کرنے کے لئے بنا تھا اس کے باشندے قرآنی تعلیمات سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں ۔ تمام سوسائٹی نیچے سے اوپر تک خرابیوں میں ڈوبی ہوئی ہے ۔ بچاؤ کا واحد علاج یہ ہے کہ معاشرہ کو قرآن مجید کی بتائی ہوئی لائنوں پر بدلا جائے ۔ ان لائنوں کو پرویز صاحب نے خوب خوب سمجھایا ہے ۔ ان کی باتیں سنئے اور ان کی کتابیں پڑھئے ۔ قرآنی تعلیمات کو سمجھنے اور اپنانے سے ہی پاکستان ' پاکستان ' بن سکے گا ۔"

پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں موضوع کے ہر گوشے کو اجال دیا ۔ اب تک میں نے تقریروں کے خلاصوں میں اپنی اور آپ کی رعایت رکھی ہے ۔ لیکن اتنے صفحے لکھ چکا ہوں کہ شاید مزید طول کو طلوعِ اسلام برداشت نہ کر سکے ۔ اسی لئے اس خطاب کا وہ خلاصہ پیش کرتا ہوں جو اخباروں کے لئے مرتب کیا گیا تھا ۔ اور پرویز صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس تقریر کو تفصیل کے ساتھ کسی دوسرے شمارے میں آپ تک پہنچا دیں ۔

تقریر کا ملخص

امن اور سلامتی میں رہنا طبعی زندگی کا جبلی تقاضا ہے ۔ لیکن انسانوں کی صورت میں مشکل یہ ہے کہ ہر فرد سے اور فرد سے آگے بڑھ کر ہر قوم اور ملک ــ خود تو امن میں رہنا چاہتا ہے لیکن دوسرے کو اس کی ضمانت نہیں دیتا ۔ وہ دوسرے پر دست درازی کرتا ہے اور اس کے امن ہی کو نہیں چھینتا بلکہ اس سے سب کچھ لے لینا چاہتا ہے ــ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے ؟

جب ایک فرد ایسا کچھ کرے تو تمدنی زندگی میں نظامِ مملکت اس کی روک تھام کرتا ہے۔ پولیس اسے گرفتار کرتی ہے۔ اور مجرم ثابت ہونے پر عدالت اسے سزا دیتی ہے۔ لیکن جب ایک قوم ایسی حرکت پر اُتر آئے تو پھر انسان نے ایسا کوئی نظام تجویز نہیں کیا ہے جس میں کوئی پولیس اس قوم کو گرفتار کرے اور کوئی عدالت اسے اس کے جرم کی سزا دے۔ ایسی صورت میں ہر قوم کو اپنی حفاظت آپ کرنی پڑتی ہے۔ لیکن چونکہ قوت کے اعتبار سے تمام اقوام یکساں نہیں اس لئے جو قوم اپنے آپ کو زیادہ طاقتور سمجھتی ہے وہ کمزور اقوام پر دست درازی کرتی ہے اسی کا نام جنگ ہے۔ کمزور قوم حتی الامکان اپنی مدافعت کرتی ہے۔ لیکن جب شکست کھاتی ہے تو پھر اس کے ساتھ بدترین مجرموں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔

اسلام نے اپنے سامنے نصب العین یہ رکھا کہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس کے لئے اس نے ضروری سمجھا کہ ایک ایسی امت تیار کی جائے جو کمزوروں پر دست درازی کرنے کی جگہ انہیں طاقتوروں کی دستبرد سے بچائے۔ اس کے لئے وہ ہر ممکن کوشش کرے کہ بغیر قوت استعمال کئے یہ مقصد حاصل ہو جائے۔ لیکن جب وہ دیکھے کہ طاقتور قوم اپنی قوت کے نشے میں معقول بات سننے کے لئے تیار نہیں تو پھر اسے قوت کے زور پر اس حد تک روکے کہ وہ کسی کمزور کو ستانے کے قابل نہ رہے۔ اس قوم کو جماعتِ مومنین کہا گیا ہے۔ مومن کے معنی ہیں دنیا کو امن کی ضمانت دینے والا۔ خدا خود "المومن" ہے اور اس کی امن دینے کی ضمانت کا عملی ظہور جماعتِ مومنین کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ یہ ہے دنیا میں جماعتِ مومنین کی ہستی کا جواز۔ اور اس کے صاحبِ قوت و اقتدار رہنے کی ضرورت۔

غور کیجئے کہ دنیا کو آج اس قسم کی جماعت کی کس قدر شدید ضرورت ہے۔ پاکستان اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں ایک ایسی جماعت کا خمیر تیار کیا جائے۔

۲۳ر نومبر

اجتماعات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ جدائی کی گھڑی قریب آ رہی ہے۔ لیکن اپنے خطابات میں پرویز صاحب نے ذہن و فکر کو وہ کچھ دیا ہے جس پر ان کے دوسرے دورہ کراچی تک سوچا جا سکتا ہے۔ عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہ پیغام دوسروں تک پہنچا کر ہر گھڑی کو سعادتوں سے منور کیا جا سکتا ہے۔ مگر دل کے تقاضوں پر غالب آنا مشکل ہے۔ بھلا اس خیال سے نجات ہو تو کیسے کہ کل پرویز صاحب جا رہے ہیں۔

آج شام ان سے ملنے کے لئے اراکین بزم طلوعِ اسلام ۴ بجے بیچ لگژری ہوٹل میں جمع ہوئے۔ لیجئے ساڑھے چار بج گئے اور پرویز صاحب آ پہنچے۔ بیچ لگژری ہوٹل ... رقص و سرود کا مرکز۔ یہاں دن سوتے ہیں اور

راتیں جاگتی ہیں۔ یہاں سرِ شام ہی میز پر گلاس کھنکنے لگتے ہیں۔۔۔ مگر یہ پچاس دیوانے کیسے ہیں جو بیچ لکژری کے شاداب سبزہ زار کے ایک گوشے میں بیٹھے۔ روح۔ جزا۔ جنت۔ عقائد اور اعمال کی باتیں کر رہے ہیں جن کی توجہ کو کوئی تحریص اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکتی ——— جن کے لئے فردوس گوش اور جنت نگاہ بے قیمت چیزیں ہیں ——— یہ اس جنت کے متمنی ہیں جو اپنے لہو سے خریدی جاتی ہے۔ ان کی جنت ان کے خونِ جگر میں پنہاں ہے۔

شفیع صاحب نے نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کی حیثیت سے مختصر سی تقریر کی۔ انہوں نے کہا:۔

"رفیقانِ محترم!

لوگ عام طور پر آخر میں شکریہ ادا کرتے ہیں۔ میں آج آپ کے شکریہ سے اپنی گفتگو شروع کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے جذبۂ خلوص اور ذوقِ عمل کو دیکھ کر میرے کارواں کے ذہن میں یہ بات یقیناً آتی ہوگی ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا!

دو سال کے بعد محترم پرویز صاحب کراچی تشریف لائے۔ ان کے اجتماعات میں کتنے ہی نئے چہرے اس بات کی شہادت ہیں کہ قرآن کریم کے پیغام نے اب بہت سی روحوں کی گہرائیوں میں اپنا ٹھکانہ بنایا ہے اور فضا پہلے سے کہیں زیادہ سازگار ہے۔

قرآن کی آواز کی مخالفت مفاد پرست لوگ آج بھی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن ہر قسم کی مفاد پرستی کے خلاف ہمیں جدوجہد کی دعوت دیتا ہے ——— یہ دعوت اقتدار پرستوں کے خلاف بھی ہے اور مذہب کے اجارہ داروں کے خلاف بھی۔ یہ سارے مفاد پرست آج بھی طلوعِ اسلام کے مخالف ہیں اور یہ اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا چکے ہیں۔ میری مراد فتوائے کفر سے ہے۔ اس تحفہ سے مسلمانوں کے بہترین مفکر اور مصلح پہلے بھی نوازے جا چکے ہیں ——— اور اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن کی آواز کو دبانے والے ذہنی طور پر سراسیم ہو چکے ہیں۔

حضرات!

قرآنی آواز کی اس ترویج میں آپ کی محنت اور خلوص کا بڑا حصہ ہے ——— مجھے یقین ہے کہ دو سال کے عرصے میں آپ نے فرداً فرداً کتنے ہی احباب تک طلوعِ اسلام کا پیغام کامیابی سے پہنچایا ہے ——— میرے ذہن میں، آپ میں سے ہر ایک کا نام اور کام محفوظ ہے اور میرے لئے یہ بات ممکن نہیں کہ میں سارے ساتھیوں کا الگ الگ شکریہ ادا کروں۔ شاید ایسی کوشش کو آپ اپنے خلوص کی توہین بھی قرار دیں۔

رفیقو!

آپ قرآن کے راستے پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری کوشش کا مقصد یہ ہے کہ ہمارا وطن عزیز اور ہمارا معاشرہ اسلامی رنگ میں رنگ جائے اور قرآن کے قالب میں ڈھل جائے۔ یہ منزل آہستہ آہستہ قریب تر آ رہی ہے۔ جب انسانی کوشش اللہ کے قانون سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو نتائج زیادہ تیزی سے مرتب ہونے لگتے ہیں۔

اس عبوری دور میں، ہمیں اپنے ذاتی اعمال اور فکر کو قرآن کریم کے مطابق بنانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ ہماری گفتگو، ہمارا عمل، ہمارا ہر معاملہ ایسا ہونا چاہیئے کہ لوگ یہ بات آسانی سے جان لیں کہ قرآن کو اپنانے سے ذاتی اور اجتماعی زندگی میں کیسی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔

رفیقانِ عزیز!

ہم اپنے مسائل پر اکثر گفتگو کرتے رہے ہیں۔ اس موقع پر میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا، کیونکہ دو سال کے بعد یہ شام آئی ہے کہ اراکین بزم طلوع اسلام میر کارواں کے ساتھ یوں جمع ہیں۔ آج کی یہ تقریب گزشتہ دس دنوں کے اجتماعات سے ذرا مختلف اور الگ ہے۔ اگرچہ مقصد وہی ہے۔ قرآن کریم کے پیغام کی اشاعت۔

مجھے یقین ہے کہ آج کی گفتگو اور پرویز صاحب قبلہ کی باتیں سننے کے بعد ہم میں سے ہر ایک، نئے حوصلہ کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول میں لگ جائے گا۔ یاد رکھیئے، ہمیں اس وقت تک اپنے کام میں مصروف رہنا ہے۔ جب تک قرآن کا پیغام پاکستان کے ہر فرد تک نہ پہنچ جاتا۔ اور اس کے بعد کوئی طاقت پاکستان کو حقیقی اسلامی ریاست بننے سے نہ روک سکے گی۔

پاکستان کے اسلامی مملکت بننے کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ اس وقت دنیا کا ہر ملک اس عظیم ریاست کے مقاصد سے نور حاصل کرے گا۔ مگر ابھی تو ہمیں پہلا مرحلہ ہی سر کرنا ہے۔

دوستو!

اب میں آپ سب کی جانب سے محترم پرویز صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اراکین بزم کو اپنے ارشادات سے نوازیں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ قرآنی بصیرت کی یہ شمع عرصہ دراز تک ہماری محفلوں کو نورانی بنائے۔

پرویز صاحب نے جواب میں بہت مختصر سی تقریر کی۔

کارواں والوں کا عزم و عمل دیکھ کر میر کارواں کا وفورِ جذبات دیدنی تھا۔ چند لفظوں میں جذبات کی دنیا

سمٹ آئی۔ انہوں نے کہا کہ جب میں کراچی آتا ہوں تو آپ کا ذوقِ عمل گویا مجھے بیتا ہوا ایک سال واپس دے دیتا ہے۔ اس بار آپ نے جیسے مجھے زندگی کے دو سال ذہنی اعتبار سے واپس دے دیئے ہیں۔ میں آپ کی محبت کی سوغات لئے واپس جاؤں گا۔

۲۴ نومبر۔

لیجئے۔ بالآخر وہ دن بھی آگیا جس کے خیال تک کو ان ہوش مند دیوانوں نے مصروف پروگرام کی گہما گہمی میں دانستہ طاق پر رکھا تھا۔ صبح ہی سے آخری سلام کہنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر ایک کا جی چاہتا تھا کہ جو سوالات اس کے دل میں ابھر رہے ہیں، سب کا جواب پرویز صاحب سے لے لے۔ وہ بھی اپنے پیش از سفر معمول کے باوجود ہر ایک سوال کا جواب خندہ پیشانی سے دیئے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ روانگی تک جاری رہا۔ ٹھیک ۲ بجے ان کی کار طیارہ گاہ پر پہنچ گئی۔ قرآنی پروانوں کا جذبۂ بے اختیار شوق انہیں پہلے ہی وہاں کشاں کشاں لے آیا تھا۔ ہر ایک سلام محبت کے لئے آگے بڑھا۔ طیارے کی اڑان کا وقت آپہنچا تو تمام احباب کی آنکھیں پرنم تھیں اور خود پرویز صاحب کا بھی یہ عالم کہ ہزار کوشش کے باوجود اپنی قلبی کیفیات کو چھپا نہیں پاتے تھے۔ اسی کشمکش کو دل میں لئے وہ طیارہ پر سوار ہوگئے۔ آخری سلام کے لئے حسبِ معمول ہاتھ اٹھایا۔ احباب نے بہ امان اللہ کہا اور طیارہ فضا کی پہنائیوں میں کھو گیا۔ احباب یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے کہ

بہ سلامت روی و باز آئی

صحیح اسلام سمجھنے کے لئے پرویز صاحب کا لٹریچر دیکھئے۔
اس کی تفصیل کے لئے ایک کارڈ ذیل کے پتہ پر بھیج دیجئے۔
میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ
۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

ظالم پنپ نہیں سکتا

[پرویز صاحب کے درسِ قرآن کے بعض مختصرات، اس سے قبل، طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکے ہیں۔ قارئین کا اس پر بھی اصرار رہا کہ اگر ان کا ہر درس طلوعِ اسلام میں شائع نہیں ہو سکتا تو کم از کم سال میں دو چار درس ہی بالفاظہٖ سامنے آجایا کریں۔ اس سلسلے میں جو مشکلات ہیں انہیں ہم اس سے پہلے متعدد بار قارئین کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں۔ بایں اس دفعہ راولپنڈی کے ایک قدیمی قرآنی دوست نے (جو ایک کہنہ مشق اسٹینوگرافر ہیں) ایک درس کو ٹیپ سے شارٹ ہینڈ میں لکھا اور پھر اسے ضبطِ تحریر میں لائے۔ ان کی یہ ہمت قابلِ داد ہے۔ وہ درس (مکررات کو حذف کرنے کے بعد) درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی کے بھی شکر گزار ہیں جن کی سعی جمیلہ سے ہمیں یہ درس تحریری شکل میں مل گیا۔ چونکہ یہ درس بالفاظہٖ ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے اس لئے آپ دیکھیں گے کہ اس میں خطابت کا انداز نمایاں ہے یہ خطاب کراچی میں بھی دیا گیا ——— طلوعِ اسلام]

برادرانِ عزیز!

ترتیب کے اعتبار سے سورۂ آلِ عمران کی ۱۵۱ آیت ہمارے سامنے آئی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک اہم سوال تشریح طلب رہ گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے آج اس کی وضاحت کر دی جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سلسلۂ کلام یوں چلا آرہا تھا کہ جماعتِ مومنین اور ان کے مخالفین میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ایک مقام پر یہاں تک کہہ دیا گیا کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید ہو جائیں یا وفات پا جائیں تو بھی اس نظام کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ گویا اس ٹکراؤ کی شدت کی یہ کیفیت تھی کہ نبی اکرمؐ بہ نفسِ نفیس میدانِ کارزار میں موجود تھے اور حضورؐ کی معیت

میں جماعت مومنین ہر دو آزمائش (تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ نبی اکرمؐ اور جماعت صحابہؓ کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں)۔ اس سے پہلی دو آیتوں میں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ شروع ہی سے یہ انداز چلا آرہا ہے کہ انبیاءؑ کی جماعت نے ان کی قیادت میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں۔ وہ سخت جانگداز مراحل سے گزرے۔ اور اس کے بعد کہیں جاکر انہیں کامیابی ہوئی۔

لڑائیاں کیوں لڑی گئیں

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اس قدر لڑائیاں کیوں لڑنی پڑیں۔ قرآن کریم نے اس ساری تفصیل کو ایک لفظ میں سمٹا دیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ لڑائیاں اس لئے ناگزیر ہوگئیں کہ ان حضراتؑ کا مشن یہ تھا کہ دنیا سے ظلم مٹا دیا جائے۔ تبلیغ سے۔ تذیر سے۔ تذکیر سے۔ وعظ ونصیحت سے عقل ودلائل سے۔ علم وبصیرت سے لوگوں کو سمجھایا جاتا تھا کہ ظلم کی روش، انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم ہے۔ پھر انہیں یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ ظلم کرنے میں مظلوم کا نقصان ہے۔ ظالم کو اس میں کچھ نہ کچھ حاصل ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات غلط ہے۔ جو شخص اپنی دانست میں دوسرے پر ظلم کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ آخرالامر تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر بین نگاہوں کو دکھائی یہی دیتا ہے کہ ظالم، صاحب قوت اور مظلوم کمزور ہوتا ہے۔ ظالم پنپتا اور مظلوم دن بدن کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ ان معاملات کے فیصلے تمہارے معیار کے مطابق نہیں ہوتے۔ ہمارا ایک اٹل قانون ہے اور اس قانون کا تقاضا یہ ہے کہ ظالم پنپ نہیں سکتا۔ ظلم آخرالامر تباہی اور بربادی لاکر رہتا ہے۔ اور حق وباطل کی کشمکش کا ماحصل یہ ہے کہ ظالم قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ اور جو جماعتیں عدل وانصاف کا علم بلند کرنے کے لئے اٹھتی ہیں آخرالامر کامیابی انہی کے حصے میں آتی ہے۔ قرآن کریم اس عظیم اصول کی شہادت میں اقوام سابقہ کی تاریخ پیش کر رہا ہے اور ایک ایک قوم کی سرگزشت سامنے لاکر بتاتا ہے کہ وہ کس طرح ظلم کے ہاتھوں تباہ وبرباد ہوئیں۔

ظلم کے لغوی معنی

ظلم کیا ہے اور یہ کس کس شکل میں سامنے آتا ہے، قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عربی زبان میں ظلم کا لفظ بڑا جامع ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں۔ کمی کرنا۔ کسی کے حق میں کمی کرنا۔ جو کسی کا ([illegible]) ہے، اسے اس سے کم دینا۔ کسی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا۔ حد سے آگے بڑھ جانا۔ کسی شے کو جس مقام پر ہونا چاہیئے، اسے اس مقام پر نہ رہنے دینا۔ یہ ہے جامع تعریف (DEFINITION) ظلم کی۔ یعنی جہاں کسی چیز کو ہونا چاہیئے، اسے وہاں نہ رہنے دینا۔ اور اس طرح معاشرہ کا توازن بگاڑ دینا۔ اسے فساد کہا جاتا ہے۔ اسی سے "الظلمۃ" ہے۔ جس کے معنی تاریکی کے ہیں۔ لیکن یہ لفظ صرف اس تاریکی کے لئے بولا جاتا ہے جہاں عام حالات میں روشنی ہونی چاہیئے لیکن وہاں روشنی نہ ہو۔

یہ تو ہوئے اس لفظ کے لغوی معنی۔ اب یہ دیکھئے کہ ان معانی کی قرآن کریم نے کس طرح وضاحت کی ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۳/۵۶)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے تو انہیں ان کے کاموں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

پورا حق نہ دینا ظلم ہے

اور اس کے بعد ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۔ خدا ظالمین کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی جو لوگ کسی کے کام کا پورا پورا معاوضہ نہیں دیتے، وہ ظالم ہیں۔ یہ ہوا ظلم کا پہلا مفہوم۔

قرآن میں دوسری جگہ ہے۔ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۳۹/۶۹)

حق کے ساتھ فیصلہ نہ کرنا ظلم ہے

ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ گویا کسی معاملہ کا حق کے ساتھ فیصلہ کر دینا عدل ہے اور حق کے خلاف فیصلہ کرنا ظلم ہے۔ حق کہتے کسے ہیں اس کی تفصیل کا تو یہ موقعہ نہیں لیکن حق کے مطابق فیصلہ کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق قرآن کریم نے اگلے الفاظ میں یہ کہہ کر تشریح کر دی ہے کہ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ۔ ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا۔ اس کا جو حق ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۳۹/۷۰) خدا کا قانونِ مکافات خوب جانتا ہے کہ کس نے کیا کام کیا ہے اور اس کام کا (value) کیا ہے۔ اس کا۔ اس کا معاوضہ کیا ہے، اسے کیا ملنا چاہیئے۔ اس کے کام کا جو معاوضہ ملنا چاہیئے اسے ٹھیک ٹھیک ادا کر دینا اور اس میں کسی قسم کی کمی نہ کرنا۔ یہ ہے عدل۔ اور اس میں کمی کر دینا ظلم ہے۔

ظلم کا پہلا مفہوم تو یہ ہوا کہ جو کسی کا حق ہے اس میں کمی کر دینا۔ اب آگے بڑھیئے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جو کچھ کسی کے پاس ہے اسے اس سے چھین لینا ظلم کی دوسری شکل ہے۔ اس حقیقت کو اس نے تذکرۂ حضرت داؤدؑ کے ضمن میں ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ وہ مثال یوں ہے کہ حضرت داؤدؑ کے پاس دو شخص اپنا مقدمہ لے کر آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ اِنَّ هٰذَا اَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۔ "یہ میرا بھائی ہے"۔ اندازہ لگایئے کہ قرآن بات کہاں سے شروع کرتا ہے۔ یہاں سے کہ یہ میرا بھائی ہے۔ اب دیکھئے کہ یہ شخص اپنے اس بھائی کے ساتھ سلوک کیا کرتا ہے۔ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۔ اس کے پاس ۹۹ دنبیاں ہیں۔ میرے پاس ایک ہی ہے۔ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا ۔ یہ کہتا ہے کہ تو اپنی ایک دنبی بھی مجھے دے دے

غور فرمایئے برادران عزیز! قرآن کریم کتنی عظیم حقیقت کو چند الفاظ میں بیان کر گیا ہے۔ ظلم کا سارا معاشی نظام، اس بنیاد پر قائم ہے، جس کے پاس ۹۹ ہیں، غریب کی دنبی ایک بھی اس کے پاس آجائے جسکے پاس ایک ہے اس کے پاس ایک بھی نہ رہے۔

مایا کو مایا ملے کر کے لمبے ہات
تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

یہ ہے وہ (ECONOMIC SYSTEM) جسے انسان کی ہوس زراندوزی نے وضع کر رکھا ہے۔ یعنی دولت دولت کو پہنچتی چلی جاتی ہے۔ امیر امیر تر۔ اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ تھوڑے سرمائے کو زیادہ سرمایہ ہڑپ کر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہے ۔ وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ۔ جب میں اس سے بات کرتا ہوں اور دلیل سے معاملہ سمجھنا سمجھانا چاہتا ہوں تو وہ دھاندلی سے مجھے مغلوب کر لیتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ۹۹ دنبیوں والے کی باتوں کے مقابلے میں ایک دنبی والے کی بات سُنے گا کون؟ یہ سرگزشت سننے کے بعد حضرت داؤدؑ نے کہا کہ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ۔ یہ ظلم ہے کہ تو اس کی ایک دنبی بھی اس کے پاس نہیں رہنے دینا چاہتا۔

اس کے بعد قرآن غلط معاشرہ کا عام انداز بیان کرتا ہوا کہتا ہے۔ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی کاروبار میں شریک ہوتے ہیں، ان کی اکثریت کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ۹۹ والا پوری کوشش کرتا ہے کہ دوسرے کا ایک حصہ بھی اس کے پاس آجائے۔ اور اس کے بعد کہا اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ مگر ہاں! جو خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان رکھتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جن سے معاشرے کے بگڑے ہوئے حالات سنور جائیں، وہ ایسا نہیں کرتے لیکن وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ۔ مشکل یہ ہے کہ ایسے لوگ بہت ہی تھوڑے ہیں۔ (۳۸/۲۵-۲۳) یہ مقدمہ پیش ہو رہا ہے اور اس کے بعد کہا جا رہا ہے ——

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۔ اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں ملک میں اقتدار دیا ہے۔ اس لئے لوگوں کے معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ کرنا —— وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى کسی کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا۔ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دے گا۔ فیصلہ کرنے میں کسی قسم کا رجحان یا میلان اثر انداز نہ ہونے پائے یہی باتیں ہیں جو حق اور عدل کی راہ میں حائل ہوا کرتی ہیں۔

ظلم کی مزید تشریح کے سلسلے میں، قرآن کریم نے قوم ثمود کی سرگزشت بیان کی ہے۔ جس کی طرف حضرت

ناقۂ صالحؑ صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ابتدائی زمانے کی بات ہے۔ جب لوگوں کا گزارہ مویشی پالنے پر ہوتا تھا۔ یہی ان کا مال تھا۔ مویشیوں کی پرورش کے لئے سب سے زیادہ ضرورت پانی کے چشموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوم ثمود کی حالت یہ تھی کہ پانی کے چشموں پر۔ نخلستانوں پر۔ چراگاہوں پر بڑے بڑے سرداروں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اور غریبوں کے جانوروں کو پانی پینے تک کے لئے نہیں ملتا تھا۔ یعنی صاحبِ قوت سرداروں نے اس رزق کے سرچشموں پر جسے خدا نے تمام مخلوق کی پرورش کے لئے بلامزد و معاوضہ عطا کیا ہے زبردستی قبضہ کر رکھا تھا۔ حضرت صالحؑ آئے اور انہوں نے ان سے کہا کہ یہ ظلم ہے۔ سرداران قوم سے بات یہ طے ہوئی کہ سب جانوروں کی باریاں مقرر کر دی جائیں۔ اپنی اپنی باری پر سب جا کر پانی پئیں۔ حضرت صالحؑ نے سمجھا کہ اس بات کی نشانی کہ تم اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہو یا نہیں، یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ بلاتخصیص اس کے کہ یہ کس کی اونٹنی ہے اس کی باری مقرر کر لیتے ہیں۔ اگر تم نے اس کی باری پر اسے پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم اپنے معاہدہ پر قائم ہو۔ اگر تم نے اسے روک دیا تو اس سے واضح ہو جائے گا کہ تم دھاندلی مچانا چاہتے ہو۔ انہوں نے یہ بات بھی مان لی۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور اس طرح انھوں نے بڑا ظلم کیا

وآتینا ثمود ناقۃ مبصرۃ فظلموا بھا (۱۷/۵۹)

یعنی خدا کا رزق جو دنیا میں بکھرا پڑا ہے۔ اس کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ غریبوں کی اونٹنیاں پانی تک نہ پینے پائیں اور بڑے بڑے جابر سردار رزق کے سرچشموں کو اپنے قابو میں لے لیں۔ ظلم ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے بتایا کہ قوم ثمود اس لئے تباہ ہوئی تھی کہ اس نے اپنے ہاں ظلم کی یہ روش عام کر رکھی تھی۔

اگلی مثال قوم شعیب علیہ السلام کی ہے۔

قوم شعیبؑ کی مثال وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ۔ (۱۵/۷۸)

یعنی یہ قوم بھی جو مدین میں رہتی تھی۔ ظالمین میں سے تھی۔

ان کا ظلم کیا تھا؟ قرآن میں ہے کہ ان کی طرف حضرت شعیبؑ آئے اور ان سے کہا وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ (۱۱/۸۴) اپنے ماپ اور تول کے پیمانے صحیح رکھو۔ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ۔ یہ پیمانے عدل کے مطابق قائم رکھو۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ لوگوں کی چیزوں میں کمی مت کیا کرو۔ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔ یہ فساد ہے۔ یہ معاشرہ کے اندر ناہمواریاں پیدا کرتا ہے۔ ایسا مت کرو۔

بظاہر بات تو یہ ماپ تول کے پیمانوں کے متعلق ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس میں معاشی نظام کا ایک بنیادی اصول بیان کر دیا ہے۔ دوسرے مقام پر قرآن کریم نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ۔

کمی کرنے والوں کا انجام تباہی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ۔ یعنی ان لوگوں کے لئے تباہی ہے۔ جن کی روش یہ ہے کہ وہ جب دوسروں سے لیتے ہیں تو اپنا پورا پورا حق لیتے ہیں وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ۔ (۳ - ۱/۸۳) لیکن جب انہیں دیتے ہیں تو پورا نہیں دیتے۔ ماپ اور تول میں کمی کر دیتے ہیں۔ آپ ذرا بنظر تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ غلط نظام معاشی چلتا ہی اس بل پر ہے کہ کسی کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ نہ دیا جائے۔

غلط معاشی نظام کی بنیاد

ایک ماہر معاشیات کا قول ہے کہ انسانیت کی تاریخ میں بدترین دن وہ تھا جب کسی زمیندار کا غلام اتنا کما کر لے آیا جو اس سے زیادہ تھا۔ جتنا وہ کھاتا تھا۔ اگر ایک کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کی محنت کا ماحصل اتنا ہی ہو جتنا انہیں مزدوری میں دے دیا جائے تو کارخانے کا مالک دوسرے دن کارخانہ بند کر دے۔ نظام سرمایہ داری تو قائم ہی اس اصول پر ہے کہ جو مزدور ایک روپے کا کام کرے اس میں سے آٹھ آنے (بلکہ اس سے بھی کم) اسے دے جائیں اور باقی مالک رکھ لے۔ یہ ہے "لینے اور دینے کے پیمانوں میں فرق رکھنا" یہی وہ ظلم تھا جس کی پاداش (یا نتیجہ) میں قوم مدین تباہ ہوئی تھی۔

مدین کا پیباؤ

اسی قوم مدین کا ایک اور واقعہ، قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بھاگ کر مدین کی سرزمین میں پہنچے۔ سفر سے تھکے ہوئے تھے۔ دیکھا کہ پانی کا چشمہ ہے۔ پاس کوئی سایہ دار درخت ہوگا اس کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس ملک سے بھاگے تھے کہ وہاں فرعونیت کا نظام تھا۔ ظلم کا دور دورہ تھا۔ خیال تھا کہ اس جگہ کھلی فضا میں عدل کا نظام ہوگا۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے تنومند، توانا چرواہے آ رہے ہیں اور چشمے سے اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں۔ ایک طرف دو لڑکیاں کھڑی ہیں جن کی، قرآن کے الفاظ میں کیفیت یہ ہے کہ ان کی بھیڑیں پیاس کی وجہ سے پانی کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتی ہیں۔ لیکن وہ آگے بڑھ کر انہیں روک رہی ہیں کہ پانی کی طرف جانے نہ پائیں۔ حضرت موسیٰؑ نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ تم اپنی پیاسی بھیڑوں کو پانی پینے کے لئے جانے کیوں نہیں دیتیں؟ انہوں نے کہا کہ جب تک یہ بڑے بڑے چرواہے اپنے جانوروں کو پانی نہ پلا لیں گے ہمارے جانور چشمے کے پاس نہیں جا سکتے۔ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور گھر میں اور مرد کوئی نہیں۔ ہم کمزور لڑکیاں ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ سنا۔ اٹھے اور ان کی دنبیوں کو پانی پلا دیا اور اس کے بعد پھر وہیں آکر بیٹھ گئے۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ

بہر زمینے کہ رفتیم آسماں پیدا ست

مصر کو چھوڑا تھا کہ وہاں فرعونی نظام تھا۔ یہاں آکر دیکھ رہا ہوں تو اس سے بھی بڑھ کر فرعونیت ہے۔ میرے آقا!

اب تیری طرف سے جو اس فقیر کی جھولی میں پڑے اسی میں بہتری ہو گی (۲۸/۲۴)

قوم نوحؑ کی داستان

اسی ضمن میں قرآن کریم نے قوم نوحؑ کا قصہ بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو نظامِ خداوندی کی طرف دعوت دی۔ اس پر قوم کے "نچلے طبقے" (غریبوں) نے لبیک کہی۔ حضرت نوحؑ نے اکابرینِ قوم سے کہا کہ تم اس دعوت کو کیوں نہیں مانتے؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں کے رذیل اور کمینے لوگ تمہارے ساتھ شامل ہو گئے ہیں ہم اگر تمہاری دعوت قبول کر لیں گے تو ہمیں بھی اسی جماعت کا رکن بننا پڑے گا۔ اور اس طرح ہم اور یہ نچلے طبقے کے لوگ ایک ہی سطح پر آ جائیں گے۔ یعنی ان کا کہنا یہ تھا کہ تمہاری دعوت تو ٹھیک ہے ہم اس کے قائل ہیں۔ لیکن ایک ایسا نظامِ معاشرت جس میں یہ ادنیٰ درجے کے لوگ ہمارے برابر بیٹھیں، ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ آپ انہیں نکال دیجئے پھر ہم آ جائیں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے کہا کہ اگر میں تمہاری خاطر ان غریبوں کو دھکا دے کر نکال دوں تو اِنِّیۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ (۱۱/۳۱) میرا شمار بھی ظالمین میں ہو جائے گا۔ اس سے قرآن کریم نے واضح کر دیا کہ بڑے لوگوں کی خاطر چھوٹے لوگوں کو دھکے دے دینا ظلم ہے۔

قرآن کریم ظلم کی اس قسم کی مثالیں دے کر ایک اصول بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب قومیں ایسی تھیں جنہیں بڑی قوت حاصل تھی پوری شان و شوکت۔ دولت و ثروت۔ قوت و اقتدار۔ لیکن ان میں سے ہر قوم کا انجام تباہی اور بربادی ہوا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے نہیں کہ ان کی فوجی طاقت میں کوئی کمی آگئی تھی ان کے اسباب و ذرائع میں کوئی نقص واقع ہو گیا بالکل نہیں۔ انہیں یہ سب کچھ حاصل تھا لیکن اس کے باوجود وہ تباہ ہو گئیں۔ اس لئے کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶) خدا ظلم کرنے والوں کی کھیتیوں کو کبھی پروان نہیں چڑھنے دیتا۔ ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

خدا کا اٹل قانون

یہاں سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ خدا پر ایمان لانا۔ اس کے قانونِ مکافات کو تسلیم کرنا کیوں ضروری ہے؟ خدا پر ایمان نہ لانے والے سمجھتے ہیں کہ اگر ہم بے پناہ قوت حاصل کر لیں۔ بے شمار دولت جمع کر لیں۔ سامانِ حرب و ضرب فراہم کر لیں اور پھر اس قسم کی تدبیریں اختیار کر لیں کہ ان چیزوں میں کمی واقع نہ ہونے پائے تو اس کے بعد جو ہمارے جی میں آئے ہم کرتے چلے جائیں۔ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ ہے وہ تصور جسے قرآن کریم کفر کا تصور کہتا ہے۔ یعنی یہ سمجھ لینا کہ اس کے بعد کوئی قوت ایسی نہیں جو ہم سے مواخذہ کر سکے۔ اس کے برعکس ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس حقیقت پر یقین رکھا جائے کہ انسانوں کے اوپر ایک بالادست قوت اور ہے، اس کا ایک قانون ہے۔

اور وہ قانون اس قدر اٹل ہے کہ تمام انسانوں کی تمام کوششوں اور تدبیروں کے علی الرغم وہ اپنا کام کرتا چلا جاتا ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ آپ سوچئے کہ اس ایمان کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی کہ وہ قوم کسی پر ظلم کرے گی ہی نہیں۔ قرآن کریم نے اقوام سابقہ کی داستانیں اس مقصد کے لئے بیان کی ہیں کہ ان تاریخی شواہد سے اس دعوے کی صداقت نکھر کر سامنے آجائے کہ ظلم کرنے والی قومیں اپنے تمام ساز و یراق کے باوجود تباہ اور برباد ہو جایا کرتی ہیں۔ آپ سورۂ عنکبوت میں دیکھئے۔ اس میں متعدد اقوام سابقہ کا تذکرہ ہے۔

تمام سابقہ اقوام کا انجام

قوم نوحؑ۔ قوم لوطؑ۔ قوم مدین۔ عاد۔ ثمود۔ ان کے علاوہ فارعون۔ فرعون۔ ہامان۔ قرآن کریم ان تمام اکابر مجرمین کا ذکر کرتا ہے۔ ان کے ظلم کی داستانیں بیان کرتا ہے اور اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ فکلاً اخذنا بذنبہ۔ ہم نے ان میں سے ہر ایک کو ان کے جرائم کی بنا پر پکڑا۔ یوں دیکھئے تو وہ قومیں اپنے اپنے وقت میں بڑی قوتوں کی مالک تھیں۔ نظر آتا تھا کہ ان پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔ لیکن خدا کے اٹل قانون مکافات نے انہیں پکڑ لیا۔ فمنھم من ارسلنا علیہ حاصبا ومنھم من اخذتہ الصیحۃ ومنھم من خسفنا بہ الارض ومنھم من اغرقنا تم دیکھو کہ کس طرح تباہیاں اور بربادیاں ان کے پیچھے لگیں۔ کوئی اس طرح تباہ ہوئے۔ کوئی اس طرح برباد۔ کوئی غرق ہوئے کسی پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ مختلف طریقوں سے ان کی بربادیاں ہوئیں۔ وما کان اللہ لیظلمھم۔ خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ ولکن کانوا انفسھم یظلمون (۲۹/۴۰) انہوں نے خود اپنے خلاف ظلم کیا تھا۔ جس کا نتیجہ تباہی تھا۔

خود اپنے اوپر ظلم

یہ ہے وہ ایمان جسے قرآن کریم راسخ کرنا چاہتا ہے کہ ظالم، ظلم کرنے سے سمجھتا یہ ہے کہ دوسرے سے زیادتی ہو رہی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ خود اپنے خلاف ظلم کر رہا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخرالامر وہ تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔ سورۂ انبیاء میں اس حقیقت کو بڑے (GRAPHIC) انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ایسے جیسے ایک نقشہ سامنے کھینچ دیا جائے۔ یہ بات یوں شروع ہوتی ہے کہ وکم قصمنا من قریۃ کانت ظالمۃ کتنی ہی بستیاں اور قومیں ایسی تھیں جنہوں نے ظلم کیا۔ تو ہم نے انہیں تباہ کر دیا۔ وانشانا بعدھا قوما اٰخرین۔ اور ان کے بعد دوسری قوموں کو اٹھا کھڑا کیا۔ انہوں نے ان کی جگہ لے لی

ظلم کے انجام میں تاخیر

اس کے بعد ان کی تباہی کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک تمہید ضروری ہے۔

یہ سوال عام طور پر دلوں میں پیدا ہوتا ہے (اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت آپ کے دل میں بھی پیدا ہو رہا ہوگا)

کہ ظلم کرنے والا ظلم کئے چلے جاتا ہے۔ ظالم قوموں کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ برابر ظلم کئے جاتی ہیں اور پنپتی چلی جاتی ہیں۔ ان کی کہیں گرفت نہیں ہوتی۔ کوئی انہیں پکڑتا ہی نہیں۔ یہ چیز انسان کو اکثر دھوکا دے جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان، خدا کے قانونِ مکافات کو اپنے پیمانوں سے ماپتا ہے اور چاہتا ہے کہ ظلم کے نتائج فوری سامنے آجائیں مظلوم کی نفسیات کا بھی یہی تقاضا ہوتا ہے۔ جس پر ظلم ہو رہا ہو وہ یہی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے ظالم کی کلائی مروڑ دی جائے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ جس طرح ظالم نے اسے تباہ کیا، اسی طرح وہ بھی تباہ ہو جائے۔ یہ ٹھیک ہے ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے۔ لیکن قانونِ مکافات کا انداز یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتیجہ کے سامنے آنے میں وقت لگتا ہے کہ جس طرح بیج بونے اور فصل پکنے میں مہینوں کا وقفہ ہوتا ہے۔ ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کئے رہتا ہے لیکن عمل اور اس کے نتیجہ کے سامنے آنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ اس نتیجہ کے سامنے آنے میں وقت لگتا ہے۔ قرآن کریم اس کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس وقت تم زمین میں بیج ڈالتے ہو اس بیج سے کھیتی اُگنے کا عمل — (PROCESS) تو اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے (واللہ سریع الحساب) لیکن وہ اپنی آخری شکل میں (محسوس شکل میں جس شکل میں تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے سامنے آئے) کچھ وقت کے بعد جا کر سامنے آتا ہے۔ یہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا اٹل فیصلہ ہے کہ عمل اور اس کے نتیجہ میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اس سے وہ لوگ جو ظلم کرتے ہیں اس فریب میں رہتے ہیں کہ انہیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ اور مظلوم بھی بعض اوقات مایوس ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ نہیں صاحب! یہاں تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہے۔ غریب کو کون پوچھتا ہے؟ ہم نے تو خدا کے حضور بھی دعائیں کر کر کے دیکھ لیا لیکن کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔

یہ ٹھیک ہے مظلوم کا جی یہی چاہتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ فوراً سامنے آجائے۔ لیکن خدا کا قانون اٹل ہے۔ وہ افراد کی خواہشات کے تابع نہیں چلتا۔ پانی نے جتنا وقت کھوکھلے کے لئے لینا ہے وہ اتنا وقت لے کر رہے گا۔ زخم نے جتنے وقت میں مندمل ہونا ہے وہ اس سے پہلے مندمل نہیں ہو سکے گا۔ خواہ ڈاکٹر کتنا ہی شفیق اور غم خوار کیوں نہ ہو۔ کسان کے بچے بھوکوں کیوں نہ مر رہے ہوں ان کے لئے فصل اپنے وقت سے پہلے نہیں پک سکتی (میں اس نکتہ کو کسی دوسرے وقت بیان کروں گا کہ عمل اور اس کے نتیجہ کے سامنے آنے میں جو وقفہ رکھا گیا ہے، افراد اور اقوام کی زندگی کے سلسلے میں اس میں کیا حکمت ہے۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ عمل کا نتیجہ تو اسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ محسوس شکل میں ایک وقت کے بعد سامنے آتا ہے۔) اس دوران میں اُن لوگوں کے احساس و شعور میں بھی نہیں ہوتا کہ ان کے خلاف کچھ ہو رہا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس دوران میں ان پر عذاب ان راہوں سے آرہا ہوتا ہے (من حیث لا یشعرون۔) جن کا انہیں احساس و شعور بھی نہیں ہوتا۔

اس تمہید کے بعد سورۂ انبیاء کے پیش کردہ نقشہ کی طرف آیئے۔ وہ کہتا ہے۔ فلمّا احسّوا باسنا۔ ہمارے قانون کے مطابق، ان قوموں کی طرف ان کی تباہی چلی آرہی تھی۔ لیکن چونکہ وہ ہنوز محسوس شکل میں نہیں تھی اس لئے وہ اس کی طرف سے غافل تھے۔ فلمّا احسّوا باسنا۔ جب انھوں نے اس تباہی کو محسوس شکل میں اپنے سامنے دیکھا۔ اذا ھم منھا یرکضون۔ تو وہاں سے لگے بھاگنے۔ لیکن ہمارے قانون مکافات نے انھیں للکارا اور کہا کہ لا ترکضوا۔ تم کہاں بھاگے جارہے ہو۔ اب تم کہیں بھاگ کر نہیں جاسکتے۔ مت بھاگو وارجعوا الی ما اُترفتم فیہ لوٹو اور اپنی ان عیش سامانیوں کی طرف چلو جن کی بنا پر تم لوگوں پر اس قدر ظلم توڑا کرتے تھے۔ لوٹ کر چلو (ومساکنکم) ان بڑے بڑے محلات کی طرف جہاں بیٹھے ہوئے تم سمجھتے تھے کہ تم تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ واپس کیوں چلو؟ لعلکم تسئلون۔ تاکہ وہاں پہنچ کر تم سے پوچھا جائے کہ کس کی محنتوں کا ماحصل تھا جس سے تم اس طرح عیش کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ (ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم) اس وقت تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ آسائشیں اور نعمتیں جو تم نے اس طرح حاصل کی تھیں اس میں تمہاری اپنی کمائی کا کس قدر حصہ تھا۔ اور غریبوں کے خون کی کس قدر آمیزش ؟ (۲۱/۱۱-۱۳)

اس طرح وہ مختلف اقوام سابقہ کی داستانیں بیان کرکے کہتا ہے وکاین من قریۃ اھلکنٰھا وھی ظالمۃ (۲۲/۴۵)

ان کے کھنڈرات کو دیکھو

کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے ہلاک کردیا۔ درآں حالت کہ وہ ظلم کرتی تھیں وھی خاویۃ علیٰ عروشھا۔ یہ ذرا دیکھو تو سہی ان کی عمارات کس طرح ان کی چھتوں پر اوندھے منہ گری ہوئی ہیں۔ وبئر معطلۃ۔ ان کے برباد شدہ کنوئیں بھی تمہارے سامنے ہیں وقصر مشید ان کے بڑے بڑے مضبوط محل، کھنڈرات میں تبدیل ہوکر ان کے اُجڑنے کی زندہ شہادت بن رہے ہیں۔ ان پر یہ تباہیاں کیوں آئیں؟ اس لئے کہ وھی ظالمۃ وہ قومیں ظلم کرتی تھیں۔ ان کا معاشرہ عدل و احسان کی بلند اقدار کو نظر انداز کرکے، سلب و نہب اور جور و استبداد پر قائم تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ تباہی اور بربادی تھا۔

انہی اقوام کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم نے ایک اور عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ وہ ان اقوام کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے فلمّا نسوا ما ذکّروا (۶/۴۴) جب ان قوموں نے ان

ظالم کی جڑ کٹ جاتی ہے

قوانین عدل و انصاف کو جو انہیں دیئے گئے تھے، بھلا دیا۔ انہیں پس پشت ڈال دیا۔ نظر انداز کردیا۔ چھوڑ دیا تو اس کے بعد یہ نہیں ہوا کہ ان پر فوری گرفت ہوگئی۔ برعکس اس کے، فتحنا علیھم ابواب کل شئ ان پر تمام چیزوں کی فراوانی کے دروازے کھل گئے حتّٰی اذا فرحوا بما اوتوا۔ تاآنکہ وہ اس دولت کے نشے میں مگن ہوگئے۔ کوئی قاعدہ قانون انہیں یاد نہ رہا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ ان پر کوئی بھی گرفت کرنے

والا نہیں۔ پکڑنے والا نہیں۔ اخذنا ھم بغتۃ فاذھم مبلسون۔ ہمارے قانونِ مکافات نے آکر یک لخت دبوچ لیا۔ اور گلے سے پکڑ لیا کہ واذاھم مبلسون۔ وہ اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پھر ان کا انجام کیا ہوا؟ فقطع دابر القوم الذین ظلموا ــــ یہ قوم جو اس طرح ظلم کرتی تھی، ہم نے اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اس کے بعد ہے۔ والحمد للہ رب العالمین ـ (۶/۴۴-۴۵) کتنا عجیب مقام ہے یہ الحمد للہ کہنے کا۔ کس قدر قابلِ حمد و ستائش ہے تمہارے خدا کا یہ قانون جس نے اپنے ذمے انسانیت کی ربوبیت لے رکھی ہے! اگر یہ قانون نہ ہوا اور دنیا میں دھاندلی ہی مچتی رہے تو ربوبیت عالمینی ناممکن ہو جائے۔ نوعِ انسانی کی عالمگیر نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ جتنی قوتیں اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوں اور انسانیت کو اس راستے کی طرف جانے سے روکیں پہلے انہیں سمجھایا جائے۔ نصیحت کی جائے۔ ان کا نفع نقصان ان کے سامنے رکھا جائے۔ اس کے باوجود وہ دھاندلی سے باز نہ آئیں تو انہیں مہلت دی جائے۔ جب وہ اس پر بھی سیدھے راستے پر نہ آئیں تو پھر ان کی گرفت کی جائے۔ اور ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جائے۔ اس لئے کہ اگر ظالم کی جڑ نہ کاٹی جائے تو مظلوم کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ جب دنیا میں ظلم کی جڑ کٹے تو یہ موقع خوشیاں منانے کا ہوتا ہے۔ والحمد للہ رب العالمین۔ ان چار الفاظ پر غور کیجئے بات کس قدر واضح ہو جاتی ہے۔ ربوبیت عالمینی سے مراد یہ ہے کہ پوری نوعِ انسانی کی نشو و نما ہونی چاہیئے۔ اگر اس کے راستے میں یہ لوگ رکاوٹیں پیدا کریں۔ اور سمجھ لیں کہ انہیں راستے سے ہٹانے والا کوئی نہیں تو انسانیت تباہ و برباد ہو کر رہ جائے۔ انسانیت کے راستے سے ان رکاوٹوں کا الگ ہو جانا وجۂ ہزار تشکر و امتنان ہے۔ ظالم کے متعلق تو ہر سعید روح کی یہ پکار ہوتی ہے کہ

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی است ‏ ‏ ‏ باش اِستا بینی کہ انجام تو چیست

عدالت انصاف

اب ایک بات اور سامنے آتی ہے۔ جسے عام طور پر انصاف کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ذہنوں میں تصور یہی ہوتا ہے کہ اگر کوئی فیصلہ کسی مروجہ قانون کے مطابق ہو تو وہ حق اور انصاف کے مطابق کہلاتا ہے۔ قانون کے خلاف فیصلہ ہو تو اسے ظلم اور بے انصافی کہا جاتا ہے ــ یہ ٹھیک ہے ایسا ہی ہونا چاہیئے لیکن قرآن کریم ایک قدم آگے جاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اگر تم نے قانون ہی ایسا بنا لیا جو ظلم پر مبنی ہے۔ تو اس کے مطابق جو فیصلے ہوں گے وہ کس طرح عدل پر مبنی ہوں گے۔ آپ غور کیجئے۔ قرآن، چور کو نہیں، چور کی ماں کو مارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہیں سب سے پہلے طے کرنا چاہیئے کہ تم قانون کس قسم کے بناؤ گے۔ اس کے لئے اس نے ایک بنیادی اصول بنایا ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی ایک انسان یا انسانوں کا گروہ دوسرے انسانوں کے

لئے قانون بنائے تو اس میں قانون بنانے والوں کی خطاپرستی کی آلائش ضرور آجائے گی۔ وہ اپنی اور اپنی پارٹی کی رعایت ضرور رکھیں گے۔ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برت لی جائے، جن کے ہاتھوں میں قانون سازی کے اختیارات ہوں، قوانین میں ان کے ذاتی رجحانات اور میلانات کی آمیزش کا امکان ناگزیر ہوتا ہے اس لئے قرآن نے کہا کہ جن اصولوں کے تابع قوانین مرتب ہونے چاہئیں انہیں انسانوں کا وضع کردہ نہیں بلکہ اس خدا کا متعین فرمودہ ہونا چاہیئے جو انسانی جذبات سے بلند اور تمام نوع انسان کا یکساں نشوونما دینے والا ہے۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں۔ اور قرآن کے اندر محفوظ۔ اس لئے اس نے فرمایا کہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون (۵/۴۵)۔ جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ضابطۂ زندگی کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ وہ ظالم ہیں۔ یہاں انہیں "ظالمون" کہا ہے۔ اور اس سے پہلی آیت میں انہیں "الکافرون" کہا ہے۔ یعنی جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ لہٰذا ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ نہ کرنا کفر اور ظلم ہے۔

ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے

لہٰذا نظام عدل و احسان اسے کہیں گے جس میں اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ اصولوں کے مطابق قانون بنائے جائیں۔ اس کے برعکس جس نظام میں قوانین لوگوں کے اپنے رجحانات اور خواہشات کے مطابق بنائے جائیں وہ نظام ظلم پر مبنی قرار پائے گا۔

سورۃ القصص میں ہے۔ فان لم یستجیبوا لک فاعلم انما یتبعون اھواءھم۔ اگر یہ تمہاری اس دعوت پر لبیک نہیں کہتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اپنے ہی جذبات اور خواہشات کا اتباع کرنا چاہتے ہیں۔

جذبات بلا اتباع وحی

ومن اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ

جو شخص اپنے جذبات کو خدا کی راہ نمائی کے تابع نہیں رکھتا۔ اور جس طرف وہ موڑتے ہیں بلا محابا اس طرف مڑ جاتا ہے تو اس سے زیادہ راہ گم کردہ اور کون ہوگا۔ ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین یہ ہیں وہ ظالم جنہیں صحیح راستہ دکھائی نہیں دیا کرتا۔ وہ وحی کی رہنمائی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور کرتے وہ ہیں جو اپنے جی میں آتا ہے۔

لہٰذا کوئی نظام، خواہ وہ سیاسی ہو۔ خواہ وہ معاشی۔ خواہ وہ تمدنی ہو۔ خواہ عمرانی۔ جو خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی کے اصولوں پر مبنی نہیں ہوگا ظالم ہوگا۔ سابقہ اقوام کی سرگزشتوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ انھوں نے ——— رزق کے چشموں پر تصرف بے جا کیا۔ اس کی تقسیم غلط کی۔ غریبوں کو دھتکارا۔ دنیوں

والے نے کہا کہ ایک دینی بھی اسی کے پاس آجائے۔ اس قسم کے خلط نظام کی جگہ صرف وہ نظام لے سکتا ہے جو وحی کے اصولوں کے مطابق متشکل ہوگا۔ اگر آپ ان اصولوں سے بے نیاز ہو جائیں گے تو وہ نظام بظاہر کتنا ہی اچھا اور عدل و انصاف پر مبنی کیوں نہ نظر آئے، کبھی عدل و انصاف پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس نے وحی کی رہنمائی چھوڑ دی۔ قوانین خداوندی کے انکار کے بعد، کوئی نظام عدل اور احسان کا نظام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس نے یہ کہا ہے کہ جن نظام میں ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں ہوتے وہ نظام ظلم پر مبنی ہوتا ہے۔

اشتراکیت اور خدا

علامہ اقبالؒ کی زندگی میں روس کے اشتراکی نظام کا بڑا چرچا تھا۔ چونکہ یہ نظام سرمایہ داری کی مخالفت کرتا تھا اس لئے بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ اسلام بھی سرمایہ داری کا مخالف ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس سلسلہ میں ایک ایسی بات کہی ہے جو بڑی محکم اور بنیادی ہے۔ انہوں نے (SIR F. YOUNG HUSBAND) کے نام اپنی چٹھی میں جو ۱۹۳۱ء میں لکھی تھی کہا کہ

BOLSHEVISM PLUS GOD IS ALMOST IDENTICAL WITH ISLAM.

اگر اشتراکیت میں خدا کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ قریب قریب اسلام کے مماثل ہو سکتی ہے۔

خدا کو اس میں شامل کیا جائے" یہ ہے بنیادی شرط۔ خدا کو اس میں شامل کرنے کے معنی کیا ہیں؟ یہ نہیں کہ آپ سرعنوان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ دیں اور اس کے نیچے اس کا نظام درج کر دیں۔ تو اس میں خدا شامل ہو جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نظام کو خدا کے نازل کردہ قوانین وضوابط اور حدود کے تابع رکھئے تو پھر یہ اسلامی ہو جائے گا۔ اس سے بے نیاز ہو جائیے تو ہر نظام کفر کا نظام ہے۔ اور ایک اشتراکیت پر ہی کیا موقوف ہے۔ دنیا کے جس نظام سے بھی، قرآن کے مفہوم کے مطابق خدا الگ ہو جائے گا۔ وہ نظام کفر و ظلم کا نظام بن جائے گا۔

بنیادی مقصد

اب آخر میں وہ بنیادی مقصد لیجئے جس کے لئے قرآن کریم اس نکتہ کو اتنی وضاحت سے بیان کرتا اور اس کی تائید میں تاریخ شواہد پیش کرتا ہے۔ وہ مقصد غور سے سننے کے قابل ہے۔ وہ اپنی مخاطب قوم سے کہتا ہے کہ ولقد اھلکنا القرون من قبلکم لما ظلموا وجاءتھم رسلھم بالبینٰت وما کانوا لیؤمنوا۔ کذالک نجزی القوم المجرمین۔

ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کو تباہ و برباد کر دیا۔ کیونکہ وہ ظلم کیا کرتی تھیں۔ حالانکہ ان کی طرف خدا کے رسول

واضح قوانین لے کر آئے تھے۔ لیکن انہوں نے ان کی صداقت کو تسلیم نہ کیا۔ لہٰذا ہم نے انہیں ان کے ظلم کی وجہ سے تباہ کر دیا۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ ۔
ان ظالم قوموں کی تباہی کے بعد ہم نے اقتدار و اختیار تمہارے ہاتھ میں دیا ہے حکومت اور مملکت تمہارے پاس آئی ہے لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰/۱۴) یہ دیکھنے کے لئے کہ تم کیا کرتے ہو! اس نے مختلف اقوام سابقہ کی سرگزشتیں بیان کیں۔ یہ بتانے کے لئے کہ وہ ظلم سے تباہ ہوئیں۔ اور اس کے بعد کہا کہ ان اقوام کے بعد ہم نے تمہارے ہاتھ میں اقتدار دے دیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ تم کیا کام کرتے ہو۔ اگر تم بھی وہی کچھ کرو گے جو پہلی قوموں نے کیا تو تم ہماری چہیتی اولاد نہیں ہو۔ جو تم سے رعایت برتی جائے گی۔ ہمارا قانون اٹل ہے وہ اس طرح تمہیں تباہ و برباد کر دے گا جس طرح اس نے پہلی قوموں کو تباہ و برباد کیا۔ اگر تم نظام عدل و احسان قائم کرو گے تو اس کی خوشگواریاں ابد در آغوش ہوں گی۔ اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی اور مرنے کے بعد بھی جنت کی زندگی۔ یہ ہے نظام عدل اور احسان کا فطری نتیجہ۔ لیکن اگر تم نے ظلم کی روش اختیار کی تو تم بھی اقوام سابقہ کی طرح تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ بات کس قدر صاف اور واضح ہے لیکن انہی کے لئے جو قرآن کے حقائق پر یقین رکھیں۔ نہ ہمارے لئے جو زبان سے قرآن اور اسلام کے الفاظ دہرائے تھکیں نہ لیکن کام وہی کریں جو تباہ ہونے والی قومیں کرتی تھیں۔ اور اس کے بعد توقع رکھیں کہ ہم خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت میں نہیں آئیں گے۔ یہ خود فریبی کی انتہا ہے۔!

یہ ہے برادرانِ عزیز! قرآن کریم کی رو سے ظلم کا مفہوم، اور ظالم کا انجام۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ۔　　والسلام۔

ضرورتِ رشتہ

ایک برسر روزگار، خوش اخلاق، اور کنوارے نوجوان کے لئے ایک رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے۔ ان کی عمر تقریباً ۲۵ سال اور ماہوار آمدنی دو صد روپے ہے۔ رشتہ کے لئے ذات پات، اعلیٰ تعلیم یا جہیز کی کوئی قید نہیں۔ البتہ لڑکی کا قرآنی فکر کا حامل ہونا ضروری ہے۔ (تفصیلات صیغۂ راز میں رہیں گی)

(الف) معرفت طلوع اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ ـــــ لاہور

نقد و نظر

فتوح البلدان

البلاذری (بغدادی) کی کتاب فتوح البلدان، ہماری قدیم تاریخی کتابوں میں خاصی شہرت رکھتی ہے امام طبری کی تاریخ، ہمارے ہاں ام التواریخ کہلاتی ہے۔ لیکن بلاذری، امام طبری سے پہلے ہوا ہے۔ (وہ ۲۰۳ھ میں پیدا ہوا، اور ۲۷۹ھ میں فوت ہوا تھا) اس لحاظ سے فتوح البلدان کو طبری کی تاریخ پر تقدم حاصل ہے۔ اس میں نبی اکرمؐ کی ہجرت سے لے کر سندھ کی فتح تک کے زمانے میں مسلمانوں نے جن بڑے بڑے ممالک کو فتح کیا، ان کی فتوحات کے واقعات اختصار سے درج ہیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مدت ہوئی سر رشتۂ تالیف و ترجمہ حیدرآباد (دکن) کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ یہ ترجمہ مولانا ابوالخیر مودودی صاحب کی کاوش کا نتیجہ تھا۔ اب یہ ترجمہ قریب قریب نایاب تھا۔ نفیس اکیڈیمی (کراچی) نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں اور دونوں ایک ہی جلد میں شائع کئے گئے ہیں۔

کتاب کا انداز روایاتی ہے۔ ہر واقعہ سے پہلے اس کی روایاتی سند لکھی گئی ہے۔ روایات کا انداز وہی ہے جو عام کتبِ روایات میں ملتا ہے مثلاً اس میں لکھا ہے کہ

> رسول اللہؐ غزوہ احزاب سے فارغ ہونے کے بعد غسل فرمانے تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کے پاس جبرئیلؑ آئے اور عرض گزار ہوئے کہ آپ نے اپنے ہتھیار کھول دئے مگر ہم نے اپنے ہتھیار نہیں کھولے۔ اس کے بعد آپؐ بنی قریظہ کی طرف تشریف فرما ہوئے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں۔ میں نے رسول اللہؐ سے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ میں نے جبرئیلؑ کو جھروکوں میں سے دیکھ لیا ان کے سر کو مٹی لگی ہوئی تھی۔ (ص ۵۴۶)

ص ۱۲۵ پر ہمیں یہ عبارت ملتی ہے۔

یہود اور مجوس نے اسلام سے کراہت کی۔ اور جزیہ دینا بہتر سمجھا۔ اس پر منافقین عرب نے کہا۔ محمدؐ نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اہل کتاب کے سوا کسی سے جزیہ قبول نہیں کریں گے۔ پھر یہ ہجر کے یہودیوں سے جزیہ کیسے قبول کر لیا۔ حالانکہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ (۵/۱۰۵)

اس آیت کا مذکورہ بالا واقعہ کے ساتھ کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ پھر اس کا جو ترجمہ لکھا گیا ہے وہ بھی صحیح نہیں۔ یعنی "اے ایمان والو! ذرا اپنی خبر رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ ہدایت پانے کے بعد گمراہوں کے دام میں آکر زیاں کار ہو جاؤ" اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو۔ اگر تم سیدھے راستے پر رہو گے تو غلط راستے پر چلنے والا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔" پھر یہودیوں کے متعلق کہنا کہ وہ اہل کتاب میں سے نہیں ہیں کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ یہ جزیہ ہجر کے مجوسیوں سے لیا گیا تھا۔ اس لئے یہاں مجوس ہی کا ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کچھ تسامح ہو گیا ہے۔

کتاب سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ اور ضخامت ۶۶۸ صفحات ہیں۔ قیمت مجلد ۱۵ روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ نفیس اکیڈیمی۔ بلاسس اسٹریٹ ——— کراچی

مفکرِ قرآن کے قلم سے

معارف القرآن کا بصیرت افروز سلسلہ

۱	معراجِ انسانیت	قیمت	۲۰ روپے
۲	من و یزداں	〃	۱۰ 〃
۳	جوئے نور	〃	۶ 〃
۴	برقِ طور	〃	۶ 〃
۵	شعلۂ مستور	〃	۶ 〃
۶	ابلیس و آدم	〃	۸ 〃

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ

چند اہم سوالات کے مختصر جواب

پرویز

پچھلے دنوں جب میں راولپنڈی اور پشاور کے دورہ پر گیا تو (منجملہ دیگر حضرات) ایک قانون پیشہ (پلیڈر) نوجوان نے، اسلام میں قانون سازی کے مسئلہ سے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے اس وقت ان سے تفصیل سے گفتگو نہ ہو سکی۔ اب انہوں نے اپنی امور کو چند سوالات کی شکل میں بھیجا ہے تاکہ میں ان کا جواب لکھوں۔ جیسا کہ قارئین طلوع اسلام کو معلوم ہے، میں ان امور کے متعلق ایک عرصہ سے متواتر لکھتا چلا آرہا ہوں، لیکن اس کے باوجود میں نے ان سوالات کا جواب دینا ضروری سمجھا ہے ـــــ ایک تو اس لئے کہ میرے نزدیک یہ وقت کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ جس کا تعلق پاکستان ہی سے نہیں بلکہ پوری کی پوری اُمت مسلمہ سے ہے اور دوسرے اس لئے کہ اس سفر میں میں نے محسوس کیا کہ اکثر لوگوں کو میرے خیالات کے متعلق براہ راست علم نہیں اور ان کا سارا تاثر ان سُنی سنائی باتوں کا مرہونِ منت ہے جو غلط پروپیگنڈہ پر مبنی ہیں۔

ان امور سے متعلق کچھ عرض کرتے وقت مجھے اس تلخ اور جگر خراش حقیقت کو بار بار دہرانا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں (بدقسمتی سے) یہ خیال عام کر دیا گیا ہے کہ مذہب کے معاملے میں کوئی شخص جس قدر زیادہ جذباتی (FANATIC) ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ پکا اور سچا مسلمان سمجھا جائے گا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہم میں کسی معاملے کو ٹھنڈے دل سے سُننے اور سمجھنے اور اس پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی ہے۔ (الا ماشاء اللہ) بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ قوم میں اس عادت کو پختہ سے پختہ تر کرنے کے ذمہ دار وہ حضرات ہیں جن کے پاس اپنے نظریہ

مسلک کی تائید میں سند اور دلیل نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنے مخالف کو شکست دینے کے لئے جھٹ سے اس حربہ پر اتر آتے ہیں کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے مسئلہ زیر نظر کو اس سیلاب میں بہا دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے آپ فریق مخالف کو تو زعم خویش) شکست دے سکتے ہیں۔ اور مسئلہ زیر نظر کو دبا بھی دیتے ہیں مگر اس سے ان مشکلات کا حل دریافت نہیں ہو سکتا جن کے لئے اس مسئلہ پر غور و خوض ضروری تھا۔ وہ مشکلات دشوار سے دشوار تر ہوتی چلی جاتی ہیں اور آخر الامر لاینحل نکبرہ جاتی ہیں۔ یہی صورت مسئلہ زیر نظر کے سلسلے میں پیدا ہو چکی ہے۔ بایں ہمہ میں اسے بار بار دہرائے چلا جاتا ہوں اس توقع پر کہ اس سے ملک کے ہوشمند طبقہ کے دل میں اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس بیدار ہو جائے اور ہم اس مشکل کا حل دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

سوالات

سوالات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کیا موجودہ معاشرے میں آج کل کے تقاضوں کے مطابق قوانین اسلامی کی ترتیب و تدوین کے لئے تنہا قرآن پر اکتفا کیا جا سکتا ہے؟

۲۔ کیا قرآن حکیم کی تفاسیر کی روشنی میں وضع کردہ کسی قانون کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کے لئے ہم اس امر کے محتاج نہیں کہ احادیث نبوی، اسوۂ حسنہ رسول صلعم، فقہاء، اجماع امت یا دیگر کسی فرد یا اجتہادی ادارہ یا عدالت کی طرف رجوع کریں؟

۳۔ کیا احادیث کے متعلق موجودہ اختلافات کو ختم کرنے کے لئے آپ ایسی صاحب علم و بصیرت ہستیوں کی مساعی سود مند ثابت نہیں ہو سکتیں؟

۴۔ کیا مملکت پاکستان کی طرف سے نافذ کردہ قوانین کی اطاعت ہم سب پر اسی طرح فرض نہیں جس طرح قرآن و سنت کے احکام کی اطاعت ہم پر فرض ہے؟

۵۔ کیا اسلام کے اندر رہ کر دین کے بارے میں سچائی معلوم کرنے کے لئے دیانتدارانہ طور پر باہمی اختلافات امت کے لئے باعث رحمت نہیں؟

۶۔ کیا ہم قوانین اسلامی کے ماخذوں میں سے احادیث نبوی کی نفی سے قرآن حکیم کی تفسیر کو زیادہ ادق بنا دینے کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ اور اس طرح قرآن میں اختلافات کو وسیع تر کرنے کا موجب نہ بنیں گے؟

اس کے بعد وہ رقم طراز ہیں۔

یہ ہیں وہ نہایت مختصر سوالات، جن سب کا نہایت مختصر جواب صرف ایک ہے کہ ہمیں قرآن حکیم کو سمجھنے، قوانین

اسلامی کے نفاذ کے لئے اور دینِ اسلام کی ہمہ گیر ترقی کی خاطر احادیثِ نبویؐ کی قدم قدم پر ضرورت پڑے گی۔ رہا اس ضمن میں موجودہ اختلافات پر قابو پانے کا سوال، تو اس کا حل میں نے اپنی دانست کے مطابق انجمن وکلاء میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا کہ مملکت وقت کی طرف سے تمام احتیاطی تدابیر کو ملحوظ رکھتے ہوئے بنایا ہوا قانون (جو یقیناً قرآن و سنّت کے مطابق ہو) تمام مسلمانوں کے لئے حرفِ آخر کی حیثیت رکھے گا اور ایسے قانون کو آخری شکل دینے سے قبل علماء کے ایک بورڈ کی تصدیق لازم ہوگی۔ اس سوال یا مشکل کا جواب، کہ بعض علماء متذکرہ الصدر صورت میں بنائے ہوئے قوانین کے خلاف جہاد تک کرنے کے ارادہ کا اظہار کر چکے ہیں یہ ہے۔ کہ ہم سب کو مل کر ایک ملک گیر تحریک چلانا چاہیئے تاکہ اس مشکل پر قابو پانے کے لئے رائے عامہ ہموار کی جا سکے۔ وصیت سے متعلق ظاہری طور پر قرآن کے منافی حدیث کی روشنی میں موجودہ قانون اور اس پر گزشتہ تیرہ سو برسوں سے مستقل طور پر عمل پیرا ہونا اس امر کی بین دلیل ہے کہ یہ مشکل لاینحل نہیں۔

جواب

سوالات آپ نے ملاحظہ فرمالئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بات سمجھنے اور سمجھانے کے لئے یہ طریق زیادہ مناسب ہوگا کہ ـــــ بجائے اس کے کہ ایک ایک سوال کا الگ الگ جواب دیا جائے ـــــ پہلے اصل مسئلہ کی وضاحت کر دی جائے۔ پھر ان مشکلات کو سامنے لایا جائے جو اس راستے میں حائل ہیں۔ اور اس کے بعد دیکھا جائے کہ ان کا حل کیا ہے؟

اصل سوال

اصل سوال یہ ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں ایسے قوانین کس طرح مرتب کئے جائیں جو اسلام کے مطابق ہوں اور ان کا اطلاق اس مملکت میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ جہاں تک میرا علم میری راہ نمائی کرتا ہے، قرنِ اول کے بعد یہ پہلا موقعہ ہے کہ کسی مملکت کے سامنے یہ سوال آیا ہو۔ قرنِ اول میں مسلمانوں میں کوئی فرقہ نہیں تھا، کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ مملکت اسلامی تھی اس لئے جو قوانین وہ نافذ کرتی تھی وہ اسلامی تسلیم کئے جاتے تھے اور ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں فرقے پیدا ہو گئے اور ہر فرقے نے اپنے لئے الگ الگ قوانین بنا لئے۔ مملکتیں بھی اسلامی نہ رہیں۔ بلکہ مسلمانوں کی سلطنتیں بن گئیں۔ ان سلطنتوں میں جو قوانین اسلام کے نام پر نافذ ہوئے وہ اس فرقہ کی فقہ پر مشتمل تھے جس سے ارباب حکومت وابستہ تھے نیز شخصی قوانین، (پرسنل لاز) مدنی قوانین (پبلک لاز) سے الگ تھے۔

آئین پاکستان میں یہ شق رکھی گئی ہے کہ یہاں کوئی قانون ایسا نافذ نہیں ہوگا جو اسلام کے خلاف ہو۔ ان قوانین کا اطلاق، مملکتِ پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ اور ان میں شخصی اور مدنی قوانین کی بھی تفریق نہیں ہوگی۔ بالفاظ دیگر اس مملکت نے فیصلہ کیا ہے کہ اس باب میں ہم تاریخ کے اس پورے درمیانی دور سے

ہٹ کر پھر سے قرنِ اول کے نظامِ قانون سازی کو قائم کرینگے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

قانون کے ماخذِ اربعہ

۲- ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلامی قانون کے چار ماخذ ہیں۔ قرآن۔ حدیث۔ قیاس۔ اجماع۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ "اس مسلّمہ" سے مفہوم کیا ہے، ہمیں پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قانون کسے کہتے ہیں اور ماخذِ قانون سے معنی کیا ہیں؟ اس کی مثال خود قرآن کریم سے لیجئے۔۔۔ قرآن کریم میں (مثلاً) ہے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (۴/۱۱) کہ وراثت جب بھی تقسیم کی جائے اس میں مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ہمارے لئے قانون ہے۔ اور دوسری طرف ہے (مثلاً) اِعْدِلُوْا (۵/۸) "عدل کرو" ظاہر ہے کہ یہاں ایک اصول بیان کیا گیا ہے۔ عدل کی سینکڑوں شکلیں ہوں گی جن کے لئے الگ الگ قوانین کی ضرورت ہوگی۔ ہم جب بھی اس قسم کا کوئی قانون بنائیں گے تو اس کی سند میں یہ کہیں گے کہ اس کا ماخذ قرآن کریم کا یہ اصول ہے۔ قرآن کریم میں چند احکام بطور قانون دئے گئے ہیں اور باقی اصول ہیں۔ اس اعتبار سے آپ دیکھئے تو قرآن کریم ہمارے لئے قانون بھی ہے اور قانون کا ماخذ بھی۔ اور ان دونوں حیثیتوں سے وہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ اس لئے اس کا ارشاد ہے کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵) تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہوگئی۔ ان باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

باقی تین ماخذ میں سے (سردست حدیث کو الگ رکھ لیجئے کیونکہ اس کی بحث آگے چل کر آتی ہے) جہاں تک قیاس اور اجماع کا تعلق ہے، آپ دیکھیں گے کہ وہ نہ قانون ہیں نہ قانون کے ماخذ۔ وہ صرف قانون سازی کے طریقے ہیں۔ یعنی قانون کے ماخذ پر غور و تدبر سے باہمی مشاورت کے بعد کوئی نیا قانون مدون کرنا۔

حدیث کی حیثیت

۳- اب حدیث کو لیجئے۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے بہت سے نظریات آتے ہیں (مثلاً) (۱) علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں تفصیل سے لکھا ہے (اور اس کی تائید میں امام اعظمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کو پیش کیا ہے) کہ نبی اکرمؐ نے قرآن کو ماخذِ قانون قرار دے کر (یعنی قرآن کے اصولوں کی روشنی میں) اپنے زمانے کے حالات اور تقاضوں کے مطابق، قوانین مرتب فرمائے۔ ان قوانین کا منشا یہ نہیں تھا کہ وہ قرآن کے قوانین کی طرح، ابدی طور پر نافذ اور غیر متبدل رہیں گے۔ (مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم، ان قوانین کو بائیلاز سے تعبیر کرتے ہیں، جو زمانے کے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں) اس کا ثبوت یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ میں حالات کے بدل جانے سے، ان قوانین میں سے ہی جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں رائج تھے کئی ایک میں تبدیلی کی گئی۔ مثلاً نبی اکرمؐ کے زمانے میں مفتوحہ زمینیں سپاہیوں میں بانٹ دی جاتی تھیں۔۔۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں فیصلہ کیا کہ یہ زمینیں مملکت کی تحویل میں رہیں گی تاکہ ان سے موجودہ اور آنے والے افراد معاشرہ کے لئے رزق مہیا کیا جائے۔

اس نقطۂ نظر سے آج اسلامی مملکت میں قانون سازی کا اصول (یا طریق) یہ قرار پائے گا کہ

(ا) قرآن کریم کے قوانین کو علیٰ حالہٖ نافذ کیا جائے۔

(ب) جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دئے ہیں، ان اصولوں کی روشنی میں اسلامی مملکت (بطریق مشاورت) اپنے حالات کے مطابق، خود قوانین مرتب کرے۔ ایسا کرنے میں وہ فطرۃً ان تمام قوانین کو اپنے سامنے رکھے گی جو اس سے پہلے اسلامی مملکت میں مرتب کئے گئے ہوں تاکہ وہ ان سے راہنمائی حاصل کرے۔

دوسرا گروہ

(ii) دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ جس طرح قرآن کریم کو ابدی اور غیر متبدل قانون اور ماخذ قانون ہونے کی حیثیت حاصل ہے، حدیث کی بھی یہی پوزیشن ہے۔ اس اعتبار سے ان کے نزدیک حدیث، قرآن کے قوانین میں اضافہ بھی کر سکتی ہے۔ ان میں ردوبدل بھی کر سکتی ہے۔ حتیٰ کہ انہیں منسوخ بھی کر سکتی ہے لیکن حدیث کے قوانین میں ایسا نہیں ہو سکتا ان میں نہ ردوبدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ۔

اہل فقہ

(iii) ایک تیسرا گروہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے ائمہ فقہ نے قرآن اور حدیث کو سامنے رکھ کر جو قوانین مرتب کر دئے ہیں وہی اسلامی قوانین ہیں۔ ان میں اب کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ (اب ان میں سے بعض حضرات یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ ان قوانین میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے) انہیں اہل فقہ (یا قدیم اصطلاح میں اہل الرائے) کہا جاتا ہے۔ چونکہ ہمارے پیش نظر بنیادی طور پر سوال حدیث کی پوزیشن کا ہے اس لئے ہم اس سے بحث کرتے ہیں۔

سنتِ رسول اللہؐ

۴۔ حدیث کو قانون اور ماخذ ماننے والوں میں ایک گروہ حدیث کی جگہ سنت کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک سُنّت رسول اللہؐ قانون اور ماخذ قانون ہے۔ یہ گروہ سنت کو حدیث سے الگ سمجھتا ہے ان کے نزدیک سنت سے مراد ہے "رسول اللہ کا وہ ثابت شدہ طریقہ جسے حضورؐ نے بہ حیثیت رسول اختیار کیا ہو" اس میں یہ دونوں شرطیں قابل غور ہیں۔ یعنی سب سے پہلے یہ کہ ——— حضورؐ کا طریقہ ثابت شدہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ پہلے سے ثابت شدہ ہے یا اب ثابت کیا جائے گا؟ اگر پہلے سے ثابت شدہ ہے تو اسے کس نے ثابت کیا ہے اور وہ کس کتاب میں ملے گا؟ اگر وہ ثابت شدہ نہیں تو اسے اب کون ثابت کرے گا؟

پھر یہ کہ کیا اس کی تفریق پہلے سے ہو چکی ہے کہ حضورؐ نے فلاں ارشاد یا عمل رسول کی حیثیت سے فرمایا تھا اور

فلاں اس حیثیت سے نہیں تھا؟ اگر یہ تفریق ہو چکی ہوئی ہے تو ایسا کس نے کیا تھا اور کس جگہ مذکور ہے؟ اگر ایسی تفریق پہلے سے نہیں ہوئی تو اسے اب کون کریگا اور کس طریق سے کرے گا؟

اس گروہ کا کہنا یہ ہے کہ یہ کام ہم کرینگے (اس کا طریق کیا ہوگا، اس کے متعلق آگے چل کر حدیث کی بحث میں لکھا جائے گا) دوسرے گروہ کے نزدیک سنت کا یہ تصور اس قدر گمراہ کن ہے کہ وہ اس کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ ہیں۔ اس کے برعکس سنت کا جو مفہوم ان حضرات کے نزدیک ہے اسے دوسرا فریق دین میں تحریف قرار دیتا ہے۔

احادیث کے مجموعے

(۱۷) اب اس گروہ کو لیجئے جو احادیث کو غیر متبدل قانون مانتا ہے۔ اس میں بہت سے فرقے ہیں اور ہر فرقہ کا مجموعۂ احادیث، جسے وہ صحیح تسلیم کرتے ہیں الگ الگ ہے ان میں سب سے پہلے بنیادی طور پر دو فرقے شیعہ اور سنی ہیں۔ شیعہ حضرات کے احادیث کے مجموعے اپنے ہیں اور وہ سنیوں کی حدیثوں کو قابلِ اعتماد تسلیم نہیں کرتے۔ سنیوں کے مجموعے اپنے ہیں۔

جہاں تک سنیوں کا تعلق ہے، ان کے ایک فرقہ (اہل حدیث) کے نزدیک صحیحین (بخاریؒ اور مسلمؒ کے مجموعے) ایسے ہیں جن کی ہر حدیث حتمی اور یقینی طور پر رسول اللہ کی حدیث اور وحی منزل من اللہ پر مبنی ہے۔ (ان دونوں کتابوں میں بخاری کو افضلیت حاصل ہے) جو شخص ان کی کسی ایک حدیث سے بھی انکار کرتا ہے وہ معصیت رسولؐ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ ان کے برعکس، دوسرے گروہ (حنفی حضرات) کے نزدیک بخاری اور مسلم کی کم از کم دو سو احادیث قابل تسلیم نہیں ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ جو آیت یا حدیث ان کے کسی امام کے قول کے خلاف ہو یا تو اس کی ایسی تاویل کی جائے جس سے وہ اس قول کے مطابق ہو جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اس آیت یا حدیث کو منسوخ سمجھا جائے۔

واضح رہے کہ بخاری یا مسلم۔ یا صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں سے کسی کو بھی نہ رسول اللہؐ نے مرتب کرا کر دیا تھا اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ (یا صحابہ کبارؓ) میں سے کسی نے ایسا کیا۔ یہ مجموعے رسول اللہؐ کی وفات کے دو تین سو سال بعد، انفرادی طور پر، لوگوں کی بیان کردہ روایات کی رُو سے مرتب کئے گئے تھے۔

ایک نیا عقیدہ

(۱۸) سنیوں ہی کا ایک گروہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ جس معیار کے مطابق احادیث کو صحیح یا غلط قرار دے کر ان مجموعوں کو مرتب کیا گیا ہے، ہم اس معیار ہی کو صحیح تسلیم نہیں کرتے، ہم ان مجموعوں کو از سرِ نو پرکھیں گے اور اپنے معیار کے مطابق صحیح احادیث کا انتخاب کریں گے۔ اس معیار کی رُو سے ہو سکتا ہے کہ جس حدیث کو اس سے پہلے صحیح قرار دیا گیا ہے اسے ہم رد کر دیں۔ اور جسے ضعیف ٹھہرایا گیا تھا اسے صحیح قرار دے کر قبول کر لیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ معیار کیا ہے جس کے مطابق یہ حضرات، احادیث کو ازسرِنو پرکھنا چاہتے ہیں! اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ جو شخص اسلام اور سیرت نبی اکرمؐ کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔ اس میں ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ مزاج شناسِ رسول ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ بتا دیتی ہے کہ فلاں حدیث رسولؐ اللہ کی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی معاملہ میں کوئی حدیث نہ ملے تو وہ یہ بھی بتا سکتا ہے کہ ایسے موقع پر رسولؐ اللہ کا فیصلہ کیا ہوتا۔ اس مزاج شناسِ رسول کی نگاہ، وہ معیار ہے جس سے احادیث کو ازسرِنو پرکھا جائے گا۔ انہی احادیث کی رُو سے یہ متعین کیا جائے گا کہ صحیح سنتِ رسول اللہؐ کیا ہے۔

۵۔ یہ ہے، مختصر الفاظ میں، حدیث کی موجودہ پوزیشن۔ اس کی روشنی میں آپ سوچئے کہ اگر قانون سازی کے لئے شرط یہ قرار دی جائے کہ

کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جائے گا جو قرآن اور حدیث (یا کتاب و سنت) کے خلاف ہو۔

یہ ناممکن ہے

تو کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہوگا کہ یہاں ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کیا جا سکے جس کا تمام مسلمانوں پر یکساں اطلاق ہو؟ اور جسے تمام مسلمان اسلامی تسلیم کر لیں؟ اگر کوئی صاحب اس کا طریقہ بتا سکیں تو ملت پاکستانیہ پر ان کا بڑا احسان ہوگا۔ یہ کہ ایسا ہونا ناممکن ہے، اس بات سے واضح ہے کہ سنتِ رسولؐ اللہ کے مطابق قانون بنانے کے مدعی گروہ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ چونکہ یہاں حنفی مسلمانوں کی اکثریت ہے اس لئے ملک میں فقہ حنفی بطور قانون رائج کر دی جائے۔ اگرچہ (اور تو اور) خود انہیں بھی اس کا اقرار اور اعتراف ہے کہ فقہ حنفی کے کئی ایک مسائل سنتِ رسولؐ اللہ کے خلاف ہیں۔

۶۔ یہ ہیں وہ حقائق جنہیں میں، اتنے عرصہ سے اہلِ ملک کے سامنے پیش کر کے ان سے درخواست کرتا چلا آ رہا ہوں کہ ان معاملات پر جذبات سے ہٹ کر غور کیجئے اور اس مشکل کا کوئی عملی حل دریافت کیجئے۔ اس کا حل تو آج تک کسی نے پیش نہیں کیا لیکن معاملہ کو جذباتی طور پر سنگین اس قدر بنا دیا گیا ہے کہ مختلف گوشوں سے یہ آوازیں بلند ہونی شروع ہو گئی ہیں کہ

اگر پارلیمنٹ نے کوئی قانون ایسا بنا دیا جو اُن کے نقطۂ خیال سے اسلام کے خلاف ہوگا تو وہ اس کے خلاف سول نافرمانی شروع کر دیں گے۔

سوچئے کہ ان حالات میں اس بدقسمت ملک کا کیا حشر ہوگا!

متفق علیہ بنیاد

۷۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان حالات میں کوئی بنیاد ایسی بھی ہے جو مختلف فرقوں کے نزدیک متفق علیہ طور پر اسلامی ہو۔ اور جس پر یہ سب متحد ہو سکیں؟ آپ جس زاویے

سے جی چاہے اس سوال پر غور کر لیجئے۔ آپ اس کے سوا کسی اور نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے کہ ایسی قدرِ مشترک قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس مشکل کا حل بھی اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ قرآن کریم کو قانون اور قانون کا ماخذ تسلیم کر لیا جائے۔ اس حقیقت پر (نظری طور پر) سب کا ایمان ہے لیکن اسے (نظری) ایمان کو عمل میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد جس معاملہ کے متعلق قانون بنانے کی ضرورت ہو۔ یہ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کریم کیا اُصول دیتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں مختلف فرقوں کی احادیث اور فقہ کا مطالعہ کیجئے۔ حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لیجئے اور اس طرح ملک کے لئے قانون مرتب کر لیجئے۔ اس کے لئے نہ کسی علماء بورڈ کی تصدیق کی ضرورت ہے نہ کسی ادارہ کی توثیق کی حاجت۔ آئینی طور پر جس اتھارٹی کو بھی قانون سازی کے اختیار دئے جائیں۔ اس کا فیصلہ قانونی حیثیت سے ملک میں نافذ ہو۔ البتہ اگر کسی کو اس قانون کے اسلامی ہونے میں اختلاف یا شبہ ہو، تو عدالتِ عالیہ کی طرف رجوع کرے۔ اس عدالت کا کام یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ قانون، قرآن کریم کے کسی قانون یا اصول کے خلاف تو نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عدالت کے جج ایسے ہونے چاہئیں جنہیں قرآن کریم پر عبور حاصل ہو۔

قانون کی اطاعت

۸۔ اب رہا قانون کی اطاعت کا سوال۔ سو اسلام میں کسی عالم، کسی مفتی، کسی مقنن یا کسی حاکم کو انفرادی طور پر اپنے کسی فیصلہ کی اطاعت کرانے کا حق حاصل نہیں۔ اسلامی مملکت، مذکورہ طریق سے جو قانون نافذ کرے (اور عدالتِ عالیہ اسے چیلنج نہ کرے)۔ افرادِ مملکت پر اس اطاعت لازم آتی ہے۔ البتہ آئینی طور پر اس قانون میں ترمیم و تنسیخ کرائی جا سکتی ہے۔ اس باب میں بھی بنیادی شرط یہی ہوگی کہ وہ تبدیلی، قرآن کریم کے کسی اصول کے خلاف نہ ہو۔

اختلافِ رائے

۹۔ کسی مسئلہ پر اختلافِ رائے کا حق ہر ایک کو حاصل ہوگا۔ لیکن جب اس معاملہ پر متعلقہ اتھارٹی کسی فیصلہ پر پہنچ جائے اور اس کے بعد وہ معاملہ "قانون" بن جائے تو پھر اس کی خلاف ورزی کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا۔ اختلافِ رائے معیوب نہیں لیکن اختلاف کی بنا پر الگ فرقہ بنا لینا اور اس کے لئے الگ احکام وضع کر کے امت میں افتراق پیدا کر دینا، اس کی قرآن کریم کی رو سے اجازت نہیں۔ باہمی مشاورت میں بحث و تمحیص کی حد تک اختلافِ رائے مفید نتائج پیدا کرتی ہے۔ لیکن قانون تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہوگا۔ امت کا فرقوں یا پارٹیوں میں بٹ جانا قرآن کی رو سے خدا کا عذاب ہے۔

۱۰۔ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ احادیث کی نفی کر دینے سے قرآن میں اختلافات وسیع تر ہو جائیں گے۔ میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے اس کی روشنی میں آپ پہلے تو اس بات پر غور کیجئے کہ مسلمانوں کے موجودہ فرقوں کے

اختلافات قرآن کے پیدا کردہ ہیں۔ یا احادیث کے؟ اس کے بعد قرآن کریم کی طرف آئیے۔ اس کا دعوےٰ یہ ہے کہ

قرآن کا دعوےٰ

(۱) اس نے اپنے احکام کو نہایت واضح، صاف، سیدھی زبان میں نکھار کر بیان کر دیا ہے احکام سے متعلق اس کی آیات، محکمات میں داخل ہیں۔ ان میں کوئی پیچ وخم نہیں۔ کوئی ابہام اور التباس نہیں۔

(۲) اس نے کہا ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ میرے اندر کوئی اختلافی بات نہیں۔

آپ فرمائیے کہ کیا اس قسم کی کتاب (قرآن کریم) کو قانون کی بنیاد قرار دینے سے اختلافات پیدا ہوں گے یا ان احادیث کو، قانون اور قانون کا ماخذ تسلیم کرنے سے جن کی اختلافی نوعیت کا ذکر اوپر آچکا ہے؟ باقی رہا احادیث کو چھوڑ دینے سے قرآن کریم کا ادق بن جانا، سو اس سے اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ تنہا قرآن کریم سے نہ اس کے احکام سمجھ میں آسکتے ہیں نہ قوانین کے اصول، تو ذرا سوچئے کہ آپ خدا کی اس کتاب کے متعلق کیا تصور قائم کرتے ہیں جس کا دعویٰ ہے کہ "میں نصیحت حاصل کرنے کے لئے بڑی آسان کتاب ہوں"!

اور اگر آپ کا اشارہ اس طرف ہے کہ قرآن کریم نے اکثر احکام کی تفاصیل نہیں دیں۔ اور اس کے لئے وہ روایات کا محتاج ہے تو اس سلسلے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ قرآن کریم کا وہ اصولی حصہ ہے جو ہمارے لئے قانون کے ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اختلافات ختم کرنے کی کوشش

(۱) آپ نے لکھا ہے کہ "کیا احادیث کے متعلق موجودہ اختلافات کو ختم کرنے کے لئے آپ ایسی صاحب علم و بصیرت ہستیوں کی مساعی سودمند ثابت نہیں ہو سکتیں"؟

احادیث کی جو کیفیت میں نے بیان کی ہے، کیا اس کے پیش نظر آپ سمجھتے ہیں کہ ان سے متعلق اختلافات کسی صورت میں بھی مٹ سکتے ہیں؟ ان کے مطالب ومعانی کا اختلاف تو ایک طرف، خود یہ بات ہی ابھی تک طے شدہ نہیں کہ جس روایت کو رسول اللہ کی حدیث کہا جاتا ہے، وہ حضورؐ کی حدیث ہے بھی یا نہیں۔ سنت رسول اللہ کے سلسلہ میں جس گروہ کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ

> کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔

اکثر حضرات یہ تجویز پیش کیا کرتے ہیں کہ آپ خود احادیث کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کیوں نہیں کر دیتے جو آپ کے نزدیک صحیح ہوں۔ آپ سوچئے کہ اگر میں یا کوئی اور صاحب، احادیث کا ایسا مجموعہ مرتب کر دیں جو ہماری بصیرت کے مطابق صحیح ہوں، تو ہمارے پاس یہ کہنے کی کیا دلیل اور سند ہو سکتی ہے کہ اس مجموعہ کی احادیث، فی الواقعہ

رسول اللہ کے ارشادات ہیں۔ جس طرح (مثلاً) امام بخاریؒ کے مرتب کردہ مجموعے کے متعلق کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ وہ حتمی اور یقینی طور پر رسول اللہ کے فرمودات ہیں، اسی طرح کسی اور کے مرتب کردہ مجموعے کے متعلق بھی دعوٰے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ آج ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم یقینی طور پر کہہ سکیں کہ فلاں حدیث فی الواقعہ فرمانِ رسول اللہ ہے۔ علاوہ بریں اگر اس قسم کا مجموعہ محض پند و نصائح کے لئے مرتب کرنا ہو، تو اور بات ہے۔ لیکن جس مجموعہ کو امت کے لئے، ابدی طور پر قانون بننا ہو، اسے آج کون مرتب کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی جرأت کرتا ہے تو وہ امت سے، اپنی بصیرت کی اطاعت، فرمانِ رسول اللہ کی حیثیت سے کراتا ہے۔ کسی اور کو اس کی جرأت ہو تو ہو، یہ عاجز تو اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔

۱۲۔ آخر میں آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے۔

آپ کا مشورہ

قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد صحیح ثابت شدہ احادیث کا یکے از ماخذانِ قوانینِ اسلامی تسلیم کرنے کا اعلان فرمائیے اور دیکھئے کہ اس کے نتائج کیسے خوشگوار ہوں گے۔ پاکستان کا ہر مسلمان آپ کی آواز پر لبیک کہتا ہوا آپ کی طرف وارفتگی کے ساتھ بڑھے گا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اس طرح آپ کی مساعی جمیلہ کے طفیل اسلامی نظام کا قیام ایک عملی شکل اختیار کر لے گا۔

محترم! آپ نے جس نیک جذبہ اور پاکیزہ مقصد کے ماتحت یہ مشورہ دیا ہے اس کی میرے دل میں قدر ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کس قسم کی باتیں کرنے سے قوم وارفتگی سے میرے پیچھے لگ سکتی ہے اگر مقصد یہی ہوتا تو میں بھی ایک ہجوم کو اپنے گرد جمع کر سکتا تھا۔ لیکن آپ سوچئے کہ جس اسلامی نظام کے قیام کی خاطر آپ یہ مشورہ دے رہے ہیں، کیا وہ نظام اس طرح سے قائم ہو سکے گا؟ اس نظام کے قیام کی اولین شرط یہ ہے کہ پاکستان میں ایسے اسلامی قوانین مرتب اور نافذ ہو جائیں جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے۔ جو کچھ میں نے پہلے عرض کیا ہے کیا اس کی روشنی میں آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان قوانین کے مرتب ہونے کا امکان ہے۔ میرے خلاف جو کچھ پراپیگنڈہ کیا گیا (اور کیا جا رہا) ہے، اس سے یہی تاثر پیدا کیا گیا ہے کہ مجھے (معاذ اللہ) احادیث سے کچھ چڑ ہے اور یہ چڑ بھی اس حد تک کہ میں جس مشن کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے ہوں ——— یعنی پاکستان میں صحیح اسلامی نظام کا قیام اور وحدتِ ملت ——— وہ مشن بھی ناکام ہوتا ہے تو ہو جائے لیکن احادیث قریب نہ آنے پائیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس حد تک تو مجھ سے ضرور متفق ہوں گے کہ بات یہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں نے ایک عرصہ تک اس اہم سوال پر غور کیا ہے اور اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کسی خطۂ زمین میں اسلامی قوانین نافذ کرنے اور ملکی

ہوئی امت کو ایک مرکز پر لانے کی اس کے سوا کوئی شکل نہیں کہ قرآن کریم کو قانون اور قانون کا ماخذ قرار دیا جائے۔ اگر اس کے علاوہ کسی اور چیز کو بھی ایسا قرار دے دیا گیا تو نہ اس قسم کے قوانین مرتب ہو سکیں گے نہ امت میں وحدت پیدا ہو سکے گی۔ اب آپ سوچئے کہ اگر میں ایک ایسی آواز بلند کر کے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لوں جسے عمل میں لانے سے یہ نتیجہ پیدا ہو تو یہ کس قدر فریب دہی اور عدالت خداوندی میں کیسا سنگین جرم ہو گا! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا تجربہ بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ آج کل (مثلاً) عائلی قوانین کے متعلق ملک میں بڑا ہنگامہ برپا ہے۔ انہیں منسوخ کرنے کے لئے ہر طرف سے آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انہیں منسوخ کرنے کے بعد ملک میں کون سے عائلی قوانین رائج ہوں گے؟ عائلی قوانین کی تنسیخ کا بل تو پارلیمان میں پیش ہو گیا ہے۔ کیا کسی طرف سے کسی ایسے مسودہ قوانین کا نوٹس بھی دیا گیا ہے۔ جو ان قوانین کی جگہ نافذ کئے جائیں۔ مختلف فرقوں کے علمائے کرام سے کہئے کہ وہ مل بیٹھ کر ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کریں جو ان سب کے نزدیک متفق طور پر اسلامی ہو۔ اور جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ بات صاف ہو جائے گی۔ جہاں تک میں اندازہ لگا سکا ہوں، ان حضرات کے ذہن میں نقشہ یہ ہے کہ موجودہ عائلی قوانین کو منسوخ کر دیا جائے اور پھر ہر فرقہ (حسب سابق) اپنے اپنے ہاں کے قوانین پر عمل پیرا ہو جائے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلامی مملکت میں قوانین کا تصور ایسا ہی ہے؟ یہ پوزیشن تو انگریز کی غلامی کے زمانے میں تھی۔ پھر اس میں اور ایک اسلامی مملکت میں کیا فرق ہوا؟

اگر یہ کہا جائے کہ کوئی فرقہ بھی اپنے ہاں کی فقہ یا احادیث کو چھوڑ کر، قرآن کو بنیاد تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو گا۔ تو پھر معاف کیجئے۔ ہمیں دیانت داری سے کام لینا چاہیئے اور یہ دعویٰ چھوڑ دینا چاہیئے کہ یہاں کوئی قانون ایسا نافذ ہو گا جو اسلام کے خلاف ہو۔ ایسی صورت میں ہو گا یہ کہ شخصی قوانین ہر فرقے کے الگ الگ ہوں گے۔ اور ملکی قوانین ملک کی مصلحت کے مطابق مرتب ہوں گے۔ اسی کو سیکولر اندازِ حکومت کہتے ہیں اور اگر صورت یہ پیدا ہو گئی کہ پارلیمان میں کسی ایک مکتبِ فکر کی مذہبی جماعت کی اکثریت ہو گئی اور انہوں نے اپنی منشا کے مطابق قوانین مرتب کر کے انہیں مختلف فرقوں پر زبردستی مسلط کرنا چاہا تو اس کا جو نتیجہ ہو گا اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں یہی وہ خدشات ہیں جن کے پیشِ نظر میں اتنی مخالفت کے باوجود اپنی اس آواز کو بلند کئے جا رہا ہوں۔ اس امید پر کہ ——— شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات!

مجھے امید ہے کہ جو سوالات مجھ سے دریافت کئے گئے تھے، ان کا جواب میری معروضات میں آ گیا ہے۔ میں ان حضرات سے جو دل سے چاہتے ہیں کہ یہاں صحیح اسلامی قوانین مرتب اور نافذ ہوں، درخواست کروں گا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ کیا اسکے سوا اسلامی قوانین مرتب کرنے اور امت کو تفرقہ سے بچانے کی کوئی اور شکل بھی ہے!

(پرویز)

مجالسِ اقبالؒ

مثنوی ۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

(مسلسل نمبر ۲)

قسط اول میں ہم نے علامہ اقبالؒ کی اس مثنوی کا ابتدائیہ پیش کیا تھا جس میں انہوں نے قارئین کتاب کو مخاطب کر کے بتایا تھا کہ جو کچھ اس مثنوی میں پیش کیا گیا ہے اس کا ماحصل کیا ہے ـــــ وہ ماحصل یہ تھا کہ عقل کو وحی کے تابع رکھنے سے شرفِ انسانیت حاصل ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد کتاب کی تمہید شروع ہوتی ہے جس میں حضرت علامہؒ اپنے مخصوص انداز کے مطابق "پیر رومیؒ" کی معیت میں رونق افروزِ محفل ہوتے ہیں۔ پہلے تین اشعار میں مولانا رومؒ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

پیر رومیؒ کا تعارف

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر — کاروانِ عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب — خیمہ را از کہکشاں سازد طناب
نورِ قرآں در میانِ سینہ اش — جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

مولانا جلال الدین رومیؒ ۱۲۰۷ء میں بلخ میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زمانہ نیشاپور میں گزرا اور خواجہ فریدالدین عطارؒ کے زیرِ تلمیذ رہے۔ پھر قونیہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور حضرت شمس تبریزیؒ کی صحبت میں تصوف کے منازل طے کئے۔ مولانا رومؒ وحدت الوجود کے قائل اور پیام بر ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور مثنوی میں اس مسلک کی تبلیغ کی ہے۔ علامہ اقبالؒ انہیں اپنا "پیر و مرشد" کہہ کر پکارتے ہیں اور اپنے کلام میں

اکثر و بیشتر ان کا ذکر کرتے ہیں - یہ چیز ارباب فکر و نظر کے لئے فی الواقعہ بڑی حیرت انگیز ہے کہ علامہ اقبالؒ جو تصوف کو اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا قرار دیتے ہیں۔ (اور وہ فی الواقعہ اجنبی پودا ہے) اور فلسفۂ وحدت الوجود کے امام شیخ اکبر ابن عربی کی فصوص الحکم کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اسی تصوف اور وحدت الوجود کے پیام بر رومیؒ کو اپنا مرشد کس طرح تسلیم کرتے ہیں ـــ بالخصوص جب دوسری طرف ان کا دعوےٰ ہے کہ وہ (علامہ اقبالؒ) جو کچھ کہتے ہیں قرآن کی روشنی میں کہتے ہیں۔ یہ واقعی ایک ایسا معمہ ہے جسے ہم حل نہیں کر سکتے (اور شاید کوئی بھی حل نہیں کر سکتا)۔ ایک بات واضح ہے اور وہ یہ کہ رومیؒ کے ہاں ایک جوش اور حرارت پائی جاتی ہے، اور ان کی یہی چیز ہے جو اقبالؒ کو بھا گئی ـــ یہ خصوصیت اقبالؒ کو کہیں بھی نظر آئے، وہ اسے بہ نگاہِ پسندیدگی دیکھتے اور اس کی تعریف کرتے ہیں ـــ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی کے مسلک یا نظریہ کو قرآنی قرار دینے کے لئے تنہا یہ چیز تو کافی نہیں ہو سکتی۔

اہل تصوف کا عقیدہ ہے کہ فلسفی، حقیقت کا ادراک ظن و قیاس کی رُو سے کرتا ہے لیکن، صوفی، حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب پاتا ہے اور آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ لیکن یہ عجیب تماشا ہے کہ جب ابن عربیؒ حقیقت کو بے نقاب دیکھتے ہیں تو وہ انہیں "وحدت الوجود" نظر آتی ہے، اور اسی حقیقت کو جب حضرت مجدد سرہندیؒ "بے نقاب دیکھتے ہیں، تو وہ انہیں (ابن عربیؒ کی حقیقت کے بالکل برعکس) "وحدت شہود" دکھائی دیتی ہے ـــ اور دونوں کے متعلق اہل تصوف کا عقیدہ ہے کہ انہوں نے حقیقت کو بے نقاب دیکھا تھا۔

بہرحال ہمیں ان "مقامات" سے کچھ واسطہ نہیں۔ ہمارے نزدیک تو کسی مسلک یا نظریہ کے "حقیقت" ہونے کا معیار ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہو۔ وہ ابن عربیؒ کے ہاں ہو یا امام سرہندیؒ کے ـــ رومیؒ کے اشعار میں ہو یا اقبالؒ کے پیغام میں ـــ ان کے ہاں جو بات قرآن کے مطابق ہو گی اسے ہم سر آنکھوں پر رکھیں گے۔ جو قرآن کے خلاف ہو گی اسے ہم مسترد کر دیں گے۔

پیر رومیؒ کے متعلق اقبالؒ نے مذکورہ صدر تین اشعار میں کہا ہے کہ وہ روشن ضمیر تھے اور کاروانِ عشق و مستی کے سالار قافلہ ـــ ان کا مقام چاند اور سورج سے بھی زیادہ بلند تھا۔ ان کا سینہ، قرآن کریم کے نور سے منور تھا، اور آئینۂ ادراک، جمشید کے جامِ جہاں نما سے بھی زیادہ مصفا۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں۔

از نے آں نے نوازِ پاک زاد   باز شورے درنہادِ من فتاد

مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی کی ابتدا اس شعر سے کی ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　از جدائی ہا شکایت می کند

اس نسبت سے حضرت علامہؒ نے پیر رومیؒ کو "نے نواز" کہا ہے اور ان کے پیغام کو "نے" سے تعبیر کیا ہے، اگرچہ زبانِ شعر میں، ہر پیغام رساں کو "نے نواز" کہہ کر پکار لیا جاتا ہے۔ اقبالؒ کا کہنا یہ ہے کہ پیر رومیؒ کے پیغام نے میرے اندر شورِ قیامت برپا کر دیا۔

رومیؒ کا پیغام

گفت جاں با محرم اسرار شد　　　خاور از خوابِ گراں بیدار شد

اس نے مجھ سے کہا کہ اب زمانے کے انداز بدل رہے ہیں۔ چھپی ہوئی حقیقتیں بے نقاب ہو رہی ہیں۔ پوشیدہ راز ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ مشرق اپنی صدیوں کی نیند سے بیدار ہو رہا ہے۔

جذبہ ہائے تازہ او را دادہ اند　　　بندہائے کہنہ را بکشادہ اند

زمانے کے تقاضوں نے اسے تازہ جذبات دئیے ہیں۔ اس کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں۔ اگر اس وقت اس کے سامنے زندگی کے حقائق نہ آئے، تو وہ بھی، مغرب کی طرح غلط راستے پر چل نکلے گا اور کاروانِ انسانیت اپنی منزل سے دور ہٹتا چلا جائے گا۔ لہٰذا وقت کی شدید ضرورت یہ ہے کہ اس کی راہ نمائی صحیح راستے کی طرف کی جائے اور اس کے لئے

جز تو اے دانائے اسرارِ فرنگ　　　کس نکو ننشست در نارِ فرنگ

باش مانندِ خلیل اللہ مست　　　ہر کہن بتخانہ را باید شکست

تجھ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں ہو سکتا۔ تو اہلِ مغرب کے رازہائے درونِ پردہ سے واقف ہے تو نے ان کے الحاد زدہ ماحول اور بے دینی سے معمور فضا میں کافی وقت گزارا ہے۔ لیکن اس سے قطعاً متاثر نہیں ہوا تو آتشکدۂ افرنگ سے، گلزارِ ابراہیمؑ بن کر نکلا ہے۔ اس لئے یہ فریضۂ خلیلی تمہارے ہی ذمے ہے کہ باطل تصورات کے بتوں کو ایک ایک کر کے توڑ دو۔ اس میں صرف مغرب کے جدید باطل تصورات ہی شامل نہیں بلکہ "ہر کہن بت خانہ" کے بتوں کا توڑنا بھی ضروری ہے۔ جو باطل تصورات ہمارے ہاں صدیوں سے مروج چلے آ رہے ہیں، ان کی تردید بھی لاینفک ہے۔ تم اٹھو اور یہ کام کرو۔

اس کے بعد پیر رومیؒ، اقبالؒ سے کہتے ہیں کہ:۔

امتحاں را زندگی، جذبِ درون　　　کم نظر ایں جذب را گوید جنون

ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد　　　بے جنونِ ذو فنون کارے نکرد

جنون ذو فنون

قوموں کی زندگی کا راز، ان ابدی اور غیر متغیر اصولوں پر یقینِ محکم میں پوشیدہ ہے جو وحی کی رُو سے ملتے ہیں۔ سطح بین انسان جو نہ ان اصولوں کی محکمیت سے واقف ہیں اور نہ ہی اس حقیقت سے آشنا کہ ایسے اصولوں پر ایمان، افراد اور اقوام کو کس قدر بے پناہ قوتیں عطا کر دیتا ہے، اسے دیوانہ پن سے تعبیر کرتے ہیں ——— ایک ایسے شخص کے نزدیک، جو آبرو کی قدر و قیمت پر ایمان نہیں رکھتا، کسی شخص کا آبرو کی حفاظت کے لئے جان دے دینا، پاگل پن قرار پاتا ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ یہ شخص اتنی سی بات کے لئے جان تک کیوں قربان کر رہا ہے۔ وہ جان ہی نہیں سکتا کہ اس سے اسے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لئے وہ اسے دیوانگی قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اس قسم کے اصولوں پر یقینِ محکم کے بغیر کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کر سکتی۔

اقبالؒ نے یہاں اس قسم کے "جنون" کے لئے "ذو فنون" ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اس "جنون" کو منفرد بنا دیتی ہے۔ عام جنون کہتے ہی اسے ہیں جس میں عقل یکسر ماؤف ہو جائے۔ عقل اور جنون دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ لیکن قرآن کی رُو سے دین نام ہے ایمان اور عقل کے امتزاج کا۔ یعنی جب انسانی عقل وحی کی روشنی میں سفرِ حیات طے کرتی ہے تو انسان منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے ——— اقبالؒ خود اسے "عشق را با زیرکی آمیختن" کہتا ہے۔

قرآن کریم نے بھی جنت (بلکہ جنتّن) کو ذَوَاتَآ اَفۡنَانٍ ($\frac{55}{48}$) کہا ہے یعنی "ذو فنون" جس میں علوم و فنون کی مختلف شاخیں، سرسبز و شاداب رہیں۔ قرآنی حقائق پر ایمان کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اس معاشرہ میں مختلف علوم و فنون، دن بدن ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ان علوم و فنون کے ماحصل کو، خدا کی متعین کردہ حدود کے مطابق نوعِ انسان کی عالمگیر نشو و نما کے لئے صرف کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد رومیؒ نے کہا ہے کہ

مومن از عزم و توکل قاہر است ——— گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

عزم و توکل

مومن کی قوت کا راز عزم اور توکل میں ہے۔ اگر اس میں یہ دو جوہر نہیں تو وہ مومن نہیں، کافر ہے۔ توکل سے مفہوم ہے قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر مکمل یقین۔ یعنی اس حقیقت پر کلّی یقین کہ قرآن کریم کا جو دعوےٰ ہے کہ ان قوانین پر عمل کرنے کا یہ نتیجہ مرتب ہوگا اور ان کی خلاف ورزی کے عواقب یہ ہوں گے، وہ دعویٰ حرفاً حرفاً صحیح ہے اور اس میں کبھی فرق نہیں آ سکتا۔ یہ ہے توکل ——— دوسرا جوہر ہے عزم۔

ایک چیز ہوتی ہے نصب العین کا تعین، اور دوسری چیز ہے اس نصب العین کے حصول کا پختہ ارادہ۔ اسی کو قرآن، ایمان اور عمل صالح سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہی دو جوہر ہیں جنہیں اقبالؒ نے (رومیؒ کی زبان میں) توکل اور عزم کہہ کر پکارا ہے — یقین محکم اور عمل پیہم۔ عزم اور توکل کی اصطلاحات، اس آیت سے لی گئی ہیں جس میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ تم ان سے معاملات میں مشورہ کیا کرو۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (۳/۱۵۸) پھر جب ایک نتیجہ پر پہنچ کر عزم کر لو تو قوانین خداوندی کی محکمیت پر بھروسہ کرتے ہوئے کام شروع کر دو۔

اس کے بعد ہے۔

خیر را او باز می داند ز شر — از نگاہش عالمے زیر و زبر

خیر و شر

انسان کے لئے سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ خیر (GOOD) کیا ہے اور شر (EVIL) کیا۔ اس مسئلہ کا حل، عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف وحی بتا سکتی ہے۔ اس لئے جب مرد مومن، وحی کی روشنی کو اپنا راہ نما بنا لیتا ہے۔ تو اس کے سامنے خیر اور شر ایک دوسرے سے الگ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور دنیا نے 'تنہا عقل' کی رو سے خیر اور شر کے جو فیصلے کر رکھے ہیں۔ وہ الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔

کوہسار از ضربتش ریزہ ریزہ — در گریبانش ہزاراں رستخیز

مستقل اقدار پر ایمان اور خیر و شر کے ابدی معیار کے متعلق یقین کامل سے، مرد مومن کے اندر ایسی بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے مخالفتوں کے پہاڑ، ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ اسے باطل کی ہر قوت کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس کی زندگی ایک مستقل جہاد اور کشمکش پیہم کی رزمگاہ ہوتی ہے۔ اس اصولی تلقین کے بعد، پیر رومیؒ، اقبالؒ سے کہتے ہیں کہ۔

تا مے از میخانہ من خوردہ — کہنگی را از تماشا بردہ

در چمن زی مثل بو مستور و فاش — در میان رنگ پاک از رنگ باش

چونکہ تم نے میری فکر و جذب سے اپنے آپ کو متاثر کیا ہے۔ اور اس طرح تقلید اور قدامت پرستی کے تمام پردے تمہاری نگاہوں سے اٹھ چکے ہیں۔ اور حقائق بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے آ گئے ہیں۔ اس لئے اب تمہیں ایک نئے انداز کی زندگی بسر کرنی ہوگی — یعنی دنیا میں رہتے ہوئے، دنیاوی آلائشوں سے پاک اور صاف زندگی — ایسے جوہروں کی حامل زندگی جو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہیں لیکن جن سے پوری دنیا متاثر ہو جائے۔

عصرِ تو از رمزِ جاں آگاہ نیست دینِ او جز حُبِّ غیر اللہ نیست

یورپ کا مادہ پرست، انسانی زندگی کو محض طبیعی زندگی سمجھتا ہے۔ اور انسانی ذات سے جو اصلِ حیات ہے،

یورپ کی مادہ پرستی

ناآشنا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی زندگی کے کسی شعبے میں بھی وحی کی جھلک نظر نہیں آتی۔ اگر انسانی ذات سے انکار کر دیا جائے تو مقصدِ حیات صرف مادی کامرانیاں رہ جاتا ہے۔ خواہ انہیں کسی طریق سے حاصل کر لیا جائے۔

فلسفی ایں رمز کم فہمیدہ است فکرِ او بر آب و گل پیچیدہ است

جو فلسفہ، زندگی کے اس تصور پر مبنی ہوگا، وہ انسانی ذات سے متعلق کوائف کو کیا سمجھ سکتا ہے؟ وہ حیوانی سطحِ زندگی سے آگے جا ہی نہیں سکتا۔

دیدہ از قندیلِ دل روشن نکرد پس ندید الّا کبود و سرخ و زرد

اس نے وحی کی روشنی سے اپنی آنکھوں کو منور ہی نہیں کیا۔ اور جن آنکھوں کا یہ عالم ہو وہ مادی چار دیواری سے آگے کچھ دیکھ ہی نہیں سکتیں۔

اے خوش آں مردے کہ دل با کس نداد
بندِ غیر اللہ را از پا کشاد!

ایسے خدا فراموش دور میں وہ مردِ مومن ازبس غنیمت ہے۔ جو حدود اللہ کے سوا ہر قسم کے طوق و سلاسل توڑ ڈالے اور باطل کی کوئی جاذبیت اُسے اپنی طرف کھینچ نہ سکے۔

اقبالؒ کو اس مقصدِ جلیل کے لئے تیار کرنے کے بعد پیرِ رومیؒ ایک احتیاط ضروری سمجھتے ہیں اور اس

صحبتِ کم نظراں

سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ۔

سرِ شیری را نہ فہمد گاؤ میش جز بشیراں کم بگو اسرارِ خویش

جو پیغام تم لے کر اٹھے ہو، وہ بڑی جرأت اور حوصلہ مندی چاہتا ہے۔ ہر شخص کا ایسا جگر نہیں ہوگا کہ اسے سن اور سمجھ سکے۔ شیروں کی باتیں، گائے بھینس اور بھیڑ بکری کی سمجھ میں نہیں آیا کرتیں۔ اس لئے اس راز کو ہر ایک کے سامنے نہ کھولنا۔

با حریفِ سفلہ نتواں خورد مے گرچہ باشد پادشاہِ روم و رے

یاد رکھو! لوگوں کو اپنا ہمدم و ندیم سوچ سمجھ اور دیکھ پرکھ کر بنانا۔ کمینہ خصلت لوگ، خواہ وہ دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے کتنے ہی اونچے کیوں نہ ہوں، اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں شریکِ محفل کر لیا جائے۔

یوسفِ مارا اگر گرگے برد　　　　بہ کہ مردے ناکسے ارزاں خرد

ہمارے یوسف کو اگر بھیڑیا کھا جائے تو یہ اس سے کہیں اچھا ہے کہ اسے کوئی ایسا آدمی خرید کر لے جائے جو اس کی قدر و قیمت نہ پہچانتا ہو۔ ہمارا جوہر ضائع ہو جائے تو اس کا اتنا غم نہیں جتنا غم اس کا ہے کہ وہ کسی ناقدرشناس کے ہاتھوں میں آجائے۔ اس سے محتاط رہنا ضروری ہے۔ صاحبِ زر طبقہ بڑی کوشش کریگا کہ تمہیں خرید لے۔ اس سے بچ کر رہنا۔ مرتے مر جانا، ان کی منڈی میں نہ پہنچنا۔

اہلِ دنیا بے تخیل بے قیاس　　　　بوریا بافانِ اطلس ناشناس

یہ لوگ جنہیں نہ خیالات کی بلندی حاصل ہے، نہ فکر کی گہرائی میسر۔ یہ کیا جانیں کہ تم کس مقام سے بات کرتے ہو۔ یہ بوریا بننے والے حریر و اطلس کی قدر کیا پہچانیں!

اعجمی مردے چہ خوش شعرے سرود　　　　سوزد از تاثیر آں جاں در وجود

اس عجمی مفکر نے کتنے پتے کی بات کہی ہے۔ جس کی تاثیر سے جسم کے اندر جان تک میں سوز پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد مثنوی میں، اس عجمی مفکر کا جو قول نقل کیا گیا ہے، اس کا انداز اگرچہ شعر کا سا ہے۔ لیکن ہے وہ دراصل نثر۔ یعنی

نالۂ عاشق بگوشِ مردمِ دنیا
بانگِ مسلمانی و دیارِ فرنگ است

اہلِ دنیا کے کانوں میں، عاشق کی آہ و فغاں کی آواز۔ بس یوں سمجھو جیسے کفرستانِ فرنگ میں جاکر کوئی اذان دے دے۔ وہ لوگ اس آواز کو کیا پہچانیں گے!

اس کے بعد پیرِ رومیؒ "اقبالؒ" کو مثبت پیغام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

معنیٔ دین و سیاست باز گو　　　　اہلِ حق را زیں دو حکمت باز گو

دین و سیاست

مسلمان دین کی حقیقت کو فراموش کر چکا ہے۔ وہ قطعاً بھول چکا ہے کہ دین اور سیاست کا باہمی تعلق کیا ہے۔ وہ دین کو، مذہب کی سطح پر لے جا چکا ہے۔ جس سے سیاست کو کوئی تعلق نہیں ہوتا اور سیاست کو سیکولرازم کے دائرے میں مقید کر دیا ہے۔ جس تک دین کی رسائی نہیں ہوتی۔ انہیں بتاؤ کہ جب سیاست، حدود اللہ کے اندر رہتی ہے تو اسے دین کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ راستہ پھولوں کی سیج نہیں۔ اس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اس راہ میں بڑی بڑی مشکلات کا

سامنا ہوگا۔ انہیں ہمت سے برداشت کرنا۔

غم خور و نانِ غمِ افسردگاں مخور زانکہ عاقل غم خورد، کودک شکر

(یہ خود مولانا رومؒ کا شعر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ) مصیبتیں برداشت کر لینا لیکن ان لوگوں کی روٹی نہ کھانا جن کا کام ہی دوسروں کے غم میں اضافہ کرنا ہے۔ جو غریبوں کا خون چوستا ہے اس کے ہاں سے کچھ نہ لینا۔ عقلمند انسان غم کھاتا ہے اور بچے میٹھے کے پیچھے لپکتے ہیں۔

سادہ زندگی

خرقہ خود بار است بر دوشِ فقیر چوں صبا جز بوئے گل سامان مگیر

اس کا علاج یہ ہے کہ اپنی ضروریات کو کم سے کم حد تک سمٹا لینا۔ بڑی سادہ زندگی بسر کرنا۔ فقیر کے پاس ایک گدڑی ہوتی ہے۔ اور وہ بھی اس کے لئے باردوش ہوتی ہے۔ تمہارا ساز و سامانِ زندگی، تمہاری فکر اور جوہر اور رنگ ہونا چاہئے تاکہ تم جہاں جاؤ وہ غیر مرئی طور پر تمہارے ساتھ رہے اور ساری دنیا اس سے فیضیاب ہوتی رہے۔

قلزمی! با دشت و در پیہم ستیز
شبنمی؟ خود را بہ گلبرگے بریز

اس کا کبھی خیال نہ کرنا کہ دنیا میں تمہاری پوزیشن کیا ہے۔ تم جس پوزیشن میں بھی ہو اپنے حسن کو جاری رکھو۔ اگر تمہیں الٰہی قوت میسر آجائے جس سے طوفان جیسی تلاطم خیزیاں برپا ہو سکیں تو اربابِ قہر و استبداد سے ٹکر لینا۔ اور اگر اس انداز کا ساز و سامان میسر نہ آئے تو کمزوروں اور ناتوانوں کے زخم کا مرہم بن جانا۔

سرِ حق بر مردِ حق پوشیدہ نیست روحِ مومن ہیچ می دانی کہ چیست

روحِ مومن کی حقیقت

آؤ تمہیں بتاؤں کہ مومن کی زندگی کیا ہے اور اس کی اصل حیات کس قسم کی ہے۔ یہ ایک مستور حقیقت ہے، لیکن مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ اور یہی وہ راز ہے جسے میں تم پر واشگاف کرنا چاہتا ہوں۔ اسے ایک تشبیہ سے سمجھو۔

قطرۂ شبنم کہ از ذوقِ نمود عقدۂ خود را بدستِ خود کشود

یوں سمجھو کہ شبنم کا ایک قطرہ، ذوقِ نمود سے، ابھرا۔ اور اس نے کسی کا محتاج ہوئے بغیر اپنی مشکل کا حل خود دریافت کیا۔

از خودی اندر ضمیرِ خود نشست رختِ خویش از خلوتِ افلاک بست

وہ بادلوں کی شکل (ابخرات کی صورت) میں تھا تو اس کا الگ وجود نہیں تھا۔ اس نے تربیتِ خویش سے اپنے آپ کو مستحکم کیا اور اس طرح اس کی جداگانہ ہستی وجود میں آگئی۔ اس کے بعد وہ آسمانوں کے خلوت کدہ سے، زمین کی

ہنگامہ آرائیوں کی طرف آگیا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد اس نے

رُخ سوئے دریائے بے پایاں نہ کرد خویشتن را در صدف پنہاں نہ کرد

اپنا رُخ "دریائے ناپیدا کنار" کی طرف نہیں کیا تاکہ اس کی جداگانہ ہستی سمندر میں گم نہ ہو جائے۔ اس نے آغوشِ صدف تک میں بھی پنہاں ہونا گوارا نہ کیا بلکہ

اندر آغوشِ سحر یک دم تپید
تا بکامِ غنچۂ نورس رسید

اس نے آغوشِ سحر میں ذرا دم لے کر تھوڑی سی حرارت اپنے اندر پیدا کی۔ اور اس کے بعد غنچۂ ناشگفتہ پر ٹپک کر اُسے شاداب پھول میں تبدیل کر دیا۔

یہ ہے مومن کی زندگی — اپنی جداگانہ ہستی کا استحکام۔ اور مقصد اس سے یہ کہ یہ دوسروں کے کام آجائے۔

اس شعر پر "تمہید" کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں، ایک نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

وحدت وجود اور اقبالؒ

رومیؒ وحدت الوجود کا قائل ہے۔ وحدت الوجود کا منتہیٰ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی جداگانہ ہستی کو ذاتِ باری تعالیٰ میں فنا کر دے یہ اصل سے الگ شدہ ذات، پھر سے اپنی اصل میں جا کر مل جائے۔ واصل بالحق ہو جائے۔ یہی اس کی انتہائی کامرانی ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اس کے برعکس اقبالؒ کا فلسفۂ خودی یہ ہے کہ انسان اپنی منفرد جداگانہ ہستی کو کہیں بھی فنا نہ کرے۔ حتیٰ کہ (اس کا پیغام یہ ہے کہ)

بخود محکم گزار اندر حضورش مشو ناپید اندر بحرِ نورش

دوسرے مقام پر ہے — یہ بحر میں گم شدن انجام ما نیست۔ اسی حقیقت کو انہوں نے "قطرۂ شبنم" کی مثال میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

رُخ سوئے دریائے بے پایاں نہ کرد

اقبالؒ کے فلسفہ کی یہی اصل و بنیاد ہے۔ اس کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ اقبالؒ کے متعلق یہ کیسے کہا جائے کہ وہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، اسے رومیؒ کا جوش و خروش پسند آگیا ہے ورنہ رومیؒ اور اقبالؒ کی منزلیں بالکل الگ الگ ہیں۔

استفسارات

۱- قرآن کریم کے احکام میں تبدیلی

ایک صاحب نے ایک بڑا اہم سوال دریافت کیا ہے۔ سوال ذرا طویل ہے۔ لیکن چونکہ وہ مجھ میں اسی صورت میں آسکتا ہے جب وہ تفصیلی طور پر سامنے آئے اس لئے ہم اسے اسی شکل میں درج کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ماہ اگست کے رسالہ ترجمان القرآن میں ایک اہم سوال اور جواب نظر سے گزرا ہے۔ ایک جرمن نومسلم نے دریافت کیا کہ فقہی احکام میں "اجتہاد" کے اصول کے تحت کہاں تک تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ ان صاحب کا خیال ہے کہ اسلام کے بہت سے تفصیلی احکام فقہاء کے اخذ کردہ اور مرتب کردہ ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بعض خاص جغرافیائی اور تمدنی حالات کی پیداوار ہیں۔ کئی صدیوں تک تو اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا گیا تھا مگر اس کے بعد اصولاً ضرورتِ اجتہاد کو تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اسے بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل کے زمانے میں یورپ کے مسلمانوں کو بعض احکام کی تعمیل میں دشواری پیش آتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ وضو کے مسئلے کو لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ وضو میں ہر مرتبہ پاؤں دھونا اہلِ یورپ کو مشکل اور غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس کے جواب میں صاحبِ ترجمان القرآن نے لکھا ہے۔

> آپ کے جرمن دوست نے اپنے سوالات کا آغاز تو اس بات سے کیا ہے کہ فقہاء کے بیان کردہ احکام میں حالات کے لحاظ سے کہاں تک ترمیم کی جاسکتی ہے۔ لیکن آگے چل کر جہاں وہ ایک متعین مثال پیش کرتے ہیں وہاں فقہا کے بیان کردہ احکام میں نہیں بلکہ خود قرآن کی نصوص میں ترمیم کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ وضو میں منہ کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھونے

اور سر پر مسح کرنے کا حکم تو قرآن میں دیا گیا ہے۔ (المائدہ آیت ۶)

اس سے ظاہر ہے کہ جس بات کا حکم قرآن مجید میں دیا گیا ہو اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے بعد (وضو کی حکمت بیان کرنے کے بعد) وہ لکھتے ہیں۔

> جاڑے کے زمانے میں یا سرد علاقوں میں پاؤں دھونے کی زحمت سے بچنے کے لئے شریعت نے پہلے ہی سے یہ آسانی رکھ دی ہے کہ آدمی ایک دفعہ وضو میں پاؤں دھونے کے بعد موزے پہن لے پھر ۲۴ گھنٹے تک مقیم کے لئے اور ۲، گھنٹے تک مسافر کے لئے پاؤں دھونے کی حاجت نہیں۔ بشرطیکہ اس دوران میں وہ موزے نہ اتارے۔

یعنی قرآن مجید نے تو یہ حکم دیا کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہو تو منہ۔ ہاتھ۔ پاؤں دھولو (وضو کر لو) اس نے کہیں نہیں کہا کہ ایک دفعہ پاؤں دھوکر موزے پہن لو تو پھر ۲۴ یا ۲، گھنٹے کے لئے پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن شریعت نے یہ آسانی رکھ دی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا "شریعت" قرآن مجید سے الگ کوئی اور چیز ہے؟ اور ایسی چیز کہ وہ قرآن مجید کے احکام میں بھی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے؟ جب جرمن نومسلم نے اپنی مشکل پیش کی تو اس سے کہا گیا کہ قرآن کی نصوص میں ترمیم کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے بعد یہ کہا گیا کہ "شریعت" نے قرآن کی نصوص میں ترمیم کر دی ہے۔

آخر میں ترجمان القرآن میں لکھا ہے۔

> ان جرمن دوست کو سمجھئے کہ حالات و ضروریات کے لحاظ سے اسلام کے فروعی احکام میں ضروری رد و بدل تو ہو سکتا ہے لیکن اس طرح کا رد و بدل کرنے کے لئے شریعت کی گہری واقفیت درکار ہے۔ ہر شخص کو سطحی طور پر یہ اختیارات نہیں دئے جا سکتے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے فروعی احکام ہیں جن میں رد و بدل ہو سکتا ہے؟ فروعی احکام تو قرآن مجید میں بھی ہیں۔ کیا ان میں بھی رد و بدل ہو سکتا ہے؟

طلوع اسلام سوال آپ نے دیکھ لیا۔ اور امید ہے اس کی اہمیت کا بھی اندازہ لگا لیا ہوگا۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ

(i) قرآن کریم کے احکام میں ـــــ خواہ وہ اصولی ہوں یا فروعی ـــ کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لا تبدیل لکلمات اللہ۔

(ii) قرآن کریم نے جن احکام کو بطور اصول بیان کیا ہے اور ان کی جزئیات خود متعین

نہیں کیں۔ اسلامی نظام حکومت (جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے) ان جزئیات کو متعین کرے گا۔ ان جزئیات میں حالات کے بدلنے سے تبدیلی ہو سکتی ہے یہ تبدیلی بھی اسی نظام کی طرف سے ہوگی۔

لیکن اس کے برعکس ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے احکام میں بھی ردوبدل ہو سکتا ہے۔ یہاں تک تو یہ تمام حضرات متفق ہیں۔ اس کے بعد ان میں سے بعض کا عقیدہ ہے کہ

(ا) ان احکام میں ردوبدل، احادیث نے کر دیا ہے، (حتیٰ کہ احادیث نے قرآن کریم کی بعض آیات کو منسوخ بھی کر دیا ہے) لیکن جو کچھ احادیث کی رو سے ہو چکا ہے اس میں اب ردوبدل نہیں ہو سکتا۔

(ب) بعض کا عقیدہ ہے کہ یہ ردوبدل فقہ نے کیا ہے (حتیٰ کہ ائمہ فقہ کے اقوال، قرآن کریم کی آیات کو بھی منسوخ کر سکتے ہیں) لیکن جو ردوبدل فقہ کی رو سے ہو چکا ہے اس میں اب کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور

(ج) بعض کا خیال ہے کہ ان فقہی احکام میں ردوبدل ہو سکتا ہے۔ اور یہ ردوبدل علمائے کرام کر سکتے ہیں۔

یہ حضرات جب "شریعت" یا "اسلام" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد (ا) احادیث کی رو سے مرتب شدہ احکام یا (ii) فقہ کی رو سے مرتب شدہ احکام ہوتے ہیں اور چونکہ احادیث اور فقہ ہر فرقہ کی الگ الگ ہے اس لئے "شریعت" یا "اسلام" بھی ہر فرقہ کا الگ الگ ہے۔

اب رہا وہ تضاد جو آپ نے ترجمان القرآن کے بیان میں دیکھا ہے۔ یعنی ایک طرف یہ کہا گیا ہے کہ قرآن کی نصوص میں ترمیم نہیں ہو سکتی۔ اور دوسری طرف یہ کہ شریعت نے اس منصوص حکم میں تبدیلی کر دی ہے تو اس کا جواب تو یہی حضرات دے سکیں گے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، ان حضرات کا عقیدہ یہی ہے کہ قرآن کے احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اور اس بیان کا ماحصل بھی ہے۔ اس کی ایک مثال تو وضو کے احکام کے سلسلے میں خود انہوں نے اپنے اس جواب میں پیش کر دی ہے۔ اس کا نام ان کے نزدیک تبدیلی نہیں "تعبیر" ہوتا ہے۔ یہ وہی "تعبیر" یا "تاویل" ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

زمن بر صوفی و ملا سلامے — کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیلؑ و مصطفیٰؐ را

۲- ایک مظلوم بیوہ

میں ایک بیوہ ہوں۔ میرا شوہر قریب چھ ماہ ہوئے وفات پا گیا۔ میری کوئی اولاد نہیں۔ نہ ہی کوئی عزیز رشتے دار ہے۔

مرحوم نے بڑی اچھی زندگی بسر کی۔ ساری عمر دوسروں کی خدمت کرتے رہے۔ اپنے پاس کچھ بچا کر نہ رکھا۔ موت ان کی اچانک واقع ہوگئی۔ ایک رہائشی مکان پیچھے چھوڑا۔ اس کے ایک حصہ میں میں رہتی ہوں۔ باقی کرایہ پر دے رکھا ہے۔ اس پر میری گذران ہے۔ مرحوم کے بھائی زندگی بھر ان سے لڑتے جھگڑتے رہے ان کی کبھی ایک پیسے کی مدد نہیں کی۔ مرحوم کو ان سے بہت ڈر تھا۔ انھوں نے یہ مکان وصیت میں مجھے لکھ دیا تھا۔ اب ان کے بھائی مجھے ستاتے ہیں۔ کہتے ہیں تمہیں مکان کا صرف چوتھا حصہ مل سکتا ہے باقی انہیں ملے گا۔ وہ مجھے مکان سے باہر نکالتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ شریعت کا فیصلہ ہے۔ وصیت کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ کیا واقعی خدا کا یہی حکم ہے؟ کیا میری کچھ داد فریاد ہو سکتی ہے؟

طلوع اسلام

خدا کا تو یہ حکم نہیں۔ اس کے حکم کی رو سے مرحوم کی وصیت کے مطابق ہی فیصلہ ہونا چاہیئے لیکن ہمارے ہاں کی مروجہ شریعت کا البتہ یہی حکم ہے اور اسی کے مطابق آج کل کا قانون بھی ہے۔ جب تک یہ قانون خدا کے حکم کے مطابق نہیں بنتا آپ کی کہیں داد فریاد نہیں ہو سکتی۔ آپ کی حالت واقعی قابل رحم ہے۔ لیکن اس میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

مفکرِ قرآن کی تحقیقِ مسلسل اور کاوشِ پیہم کا بے مثال شاہکار

انسان نے کیا سوچا؟

عہدِ افلاطون سے لے کر عصرِ حاضر تک انسانی فکر کن دشوار گزار مرحلوں کو طے کرتی ہم تک پہنچی!

ایک عبرت آموز روئیداد ——— ایک علم افروز داستان ——— ایک بصیرت انگیز تجزیہ

ممتاز جرائد کا خراجِ تحسین

فاضل مصنف چوہدری غلام احمد پرویز کی یہ تصنیف صرف علماء و محققین کے لئے قابل مطالعہ نہیں بلکہ اس کی افادیت اور مقصدیت کے پیش نظر کالجوں کے طلبا کیلئے اس کا مطالعہ زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ ——— ("نوائے وقت"۔ لاہور)

یہ کتاب نوجوانوں کیلئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے ۴۰۰ صفحات کی یہ کتاب ہزاروں کتابوں کا نچوڑ ہے۔ ——— ("قندیل" ویکلی۔ لاہور)

(قیمت ۱۲ روپے)

ادارہ پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور